

(افسانے)

شہر افسوس



انظر حسين

شہر افسوس

(افسانے)

انتظار حسین

وہ جو کھوئے گئے

ڈنٹی سروا لے آدی نے درخت کے سنے سے اسی طرح سر لٹا لے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ چمچا "ہم نکل آئے ہیں؟"

ہارنیش آدی نے اطمینان بھرے لہجہ میں کہا۔ "خدا کا شکر ہے ہم سلامت نکل آئے ہیں۔"

اس آدی نے جس کے گلے میں حلیہ پڑا تھا تانیر میں سر ہلایا۔ "بے شک بے شک کم از کم اپنی جانیں بچا کر لے آئے ہیں۔"

بھراس نے ڈنٹی سروا لے کے سر پر ہندگی ہوئی پٹی کی طرف دیکھا۔ "تیرے زخم کا اب کیا حال ہے؟"

ڈنٹی سروا لے ہوا۔ "مجھے لگتا ہے کہ خون ابھی تھوڑا تھوڑا رہ رہا ہے۔"

ہارنیش آدی نے بھراسی اطمینان بھرے لہجہ میں کہا۔ "عزیز شکر مت کر۔ خون رک جائے گا اور زخم اٹھ چاہے تو جلد بھر جائے گا۔"

ڈنٹی سروا لے نے پوری آنکھیں کھول کر ایک ایک کو دیکھا۔ بھراسی اٹھا کر ایک ایک کو کتا۔ ہارنیش آدی کو قہقہے والے آدی کو

نوجوان کو۔ بھرتجب سے ہوا۔ "ایک آدی کہاں ہے؟"

نوجوان چونک پڑا۔ "کیا؟... ایک آدی کم ہے؟"

ہارنیش آدی نے نوجوان کو قہقہے سے دیکھا۔ بھرتجب ڈنٹی سروا لے کو زخم لہجہ میں سرزنش کی۔ "عزیز ہم اتنی تعداد میں نہیں ہیں کہ تو سمجھنے میں گھٹا کرے۔"

قہقہے والے ہارنیش آدی کی تانیر کی بھراسی کے ساتھ ایک ایک کو کتا۔ ہارنیش آدی کو ڈنٹی سروا لے کو نوجوان کو۔ بھرتجب گیا۔

ہوا "ایک آدی کہاں ہے؟"

نوجوان نے ہراساں ہار قہقہے والے کو دیکھا۔ بھرتجب ایک ایک کو کتا ہارنیش آدی کو قہقہے والے کو ڈنٹی سروا لے کو بھرتجب کی

لہجہ میں ہوا۔ "کہاں گیا ایک آدی؟"

ہارنیش آدی نے فضیلی نظروں سے تینوں کو دیکھا۔ بھرتجب اٹھا کر ایک ایک کو دیکھا ڈنٹی سروا لے کو قہقہے والے کو نوجوان کو

ٹھٹھک گیا۔ پھر گنا۔ پھر ٹھٹھکا۔ تیسری بار پھر بڑی احتیاط سے گنا اور پھر ٹھٹھک گیا۔ دوسرے سے بڑ بڑایا۔ "جب بات ہے۔"
پھر چاروں نے ایک ہر اس بھری حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر وہی ایک خنجر و ایک دقت میں چاروں کی زبان پر آج
کچھ سرگوشی کی کیفیت لے ہوئے "جب بات ہے۔" پھر چپ ہو گئے۔
وہ ایک لمبی چپ تھی۔ مگر کبھی ایک کتاب ہو سکتے لگا تھا۔ نو جوان نے خوف بھری نظروں سے سب کو دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "یہ
کتاباں بھٹک رہا ہے۔"

ڈنٹی سردالے نے بے حلقی سے کہا "کوئی ہوگا؟ جس پر بھٹک رہا ہے۔"

"وی ہوگا۔" پارٹیش آدی نے احاد سے اونچی آواز میں کہا "اسے زیادہ دور نہیں ہونا چاہیے وہ سب کبھی ہم سے بچھا ہے۔"
ڈنٹی سردالے نے پاس پڑی ہوئی لاٹھی اٹھائی اور اٹھتے ہوئے بولا۔ "اگر یہ وی ہے اور کتے نے اس کا رستہ روکا ہوا ہے تو میں
جاتا ہوں اور اسے لے کر آتا ہوں۔"

ڈنٹی سردالہ لاٹھی کے اس طرف چلا گیا جس طرف کتے کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ تینوں چپ بیٹھے رہے۔ پھر قہقہے والا
بولا۔ "کیا واقعی وی ہوگا۔"

پارٹیش آدی بولا۔ "اس کے سوا اس غیر وقت میں اس غیر جگہ اور کون ہو سکتا ہے۔"

"ہاں وی ہوگا۔" قہقہے والا اب کسی قدر اطمینان کے لہجہ میں بولا۔ وہ آگے بڑھتا تھا۔ رستے میں کبھی خنجر آ جاتا تو وہ
رک کر کھڑا ہو جاتا تھا۔"

نو جوان پھر ٹھٹھک بھرے لہجے میں بولا۔ "مگر کیا تم نے غور کیا کہ اب کتے کی آوازیں آ رہی۔"

قہقہے والے نے تصویزی دیر کان لگا کر کتے کی کوشش کی پھر کہا "ہاں اب آوازیں آ رہی۔ جانے کیا بات ہے۔"

پارٹیش آدی نے اطمینان والے کے لہجہ میں کہا "کتے کو دووں نے مل کر بھگا دیا ہے۔ اب وہ آ رہے ہوں گے۔"

پھر تین چپ ہو گئے جس طرف ڈنٹی سردالہ گیا تھا اسی طرف ان کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ قہقہے والا اس طرف ٹھٹھکی ٹھٹھکی کر
رہا۔ پھر جیسے جیسے دیکھا گیا ہو سکتے لگا۔ "وہ تو آگیا ہی آ رہا ہے۔"

"اکیلا؟" پارٹیش آدی نے سوال کیا۔

"ہاں اکیلا۔"

تینوں ڈنٹی سردالے کو دیکھتے رہے۔ ڈنٹی سردالہ آجیا۔ لاٹھی اٹکے ہوئے بیٹھا اور بولا۔ "وہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

قہقہے والے نے قہج سے سوال کیا۔ "پھر کتاب کس پر بھٹکا تھا؟"

نو جوان بولا۔ "کتے خلا میں تو نہیں بھٹکتے۔"

ڈنٹی سردالہ کہنے لگا۔ "مگر وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔"

"بڑی عجیب بات ہے۔" قہقہے والے نے کہا۔

نو جوان نے پھر کان کھڑے کئے۔ پھر بولا "کیا خیال ہے یہ کتے کے بھونکنے کی آواز نہیں ہے۔" سب نے کان لگا کر سننے

لگے۔ پھر پارٹیش آدی ڈنٹی سردالے سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "تم کہاں لٹھل گئے تھے۔ کتے کی آواز تو اس طرف سے آ رہی
ہے۔"

قہقہے والے نے ڈنٹی سردالے کے قریب پڑی ہوئی لاٹھی اٹھائی۔ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "میں جا کر دیکھتا ہوں۔"

پارٹیش آدی بھی اٹھ کھڑا ہوا "سب چل کر کیوں نہ دیکھیں۔"

یہ سن کر باقی دو بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ چاروں مل کر اس طرف گئے جس طرف سے ابھی ابھی کتے کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔

دور تک گئے۔ کچھ نظر نہ آیا۔ قہقہے والا پلٹے پلٹے بڑ بڑایا۔

"میںاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

پارٹیش آدی نے اس کی صحت بندھائی۔ کہا کہ "پکار کر دیکھو اسے یہیں کبھی ہونا چاہیے آخر پھر وہاں تو نہیں تھا کتاب ہو گیا۔"

ڈنٹی سردالے نے کسی قدر ایمان لہجہ میں کہا۔ "ہاں پکار کر بھی دیکھ لو۔" اور اس نے پکارنے کی نیت سے جھر جھری لی۔ پھر

اچانک ٹھٹھکا۔ قہقہے والے سے مخاطب ہوا۔ "میرے ذہن سے تو اس کا نام ہی اتر گیا۔ کیا نام تھا اس کا؟"

"نام؟" ڈنٹی سردالے نے ذہن پر زور ڈالا "نام تو اس کا گھٹے پاؤں کا رہا۔" پھر نو جوان سے مخاطب ہوا۔ "نو جوان تجھے یاد ہو
کا؟"

نو جوان نے جواب دیا۔ "نام کیا مجھے تو اس کی صورت بھی یاد نہیں۔"

"صورت بھی یاد نہیں۔" قہقہے والا سوچ میں پڑ گیا۔ بولا "جب بات ہے اس کی صورت مجھے بھی یاد نہیں آ رہی۔" پھر پارٹیش

آدی سے مخاطب ہوا۔ "اے بزرگ تجھے تو اس کی صورت یاد ہوگی اور نام بھی۔"

بارش آدی سوچ میں پڑ گیا۔ ذہن پر زور ڈال کر سوچتا رہا۔ پھر شکر لہجہ میں بولا۔ "عزیز دہشت چلو کر اب ڈھونڈنے میں جو کچھ ہے۔"

"کیوں؟"

"یوں کہ اب نہ ہمیں اس کا نام یاد ہے نہ صورت یاد ہے۔ ایسی صورت میں کیا خبر کون مل جائے۔ ہم سمجھیں کہ وہ ہے اور وہ نہ ہو کوئی اور ہو۔ یہ طے وقت ہے اور ہم راستے میں ہیں۔"

چاروں پلٹ پڑے۔ چلتے چلتے پھر وہیں آ گئے جہاں سے چلے تھے۔ پھر انہوں نے آگ روشن کی اور قہیلے والے نے قہیلے سے موتا جھوٹا لکڑا آگ پر پکایا۔

کھانے پینے کے بعد انہوں نے آگ پر ہاتھ تاپے اور انہیں یاد کر کے آبدیدہ ہوئے جنہیں وہ چھوڑ آئے تھے۔

"مگروہ آدمی کون تھا؟ تو جو ان کے سوال کیا۔"

سب نے اچانک پن میں پوچھا۔ "کون آدمی؟"

"وہ جو ہمارے صرافہ تھا اور پھر ہم سے ٹوٹ گیا۔"

"وہ آدمی؟" پھاوہ آدمی..... "سے تو ہم بھول ہی چلے تھے۔ کون تھا وہ؟"

"عجب بات ہے۔" قہیلے والا کہنے لگا۔ "نہیں اس کا نام یاد رہا نہ صورت یاد رہی۔"

"تو کیا وہ ہم میں سے نہیں تھا؟"

تو جو ان کے اس سوال پر سب تالے میں آ گئے۔ پھر قہیلے والا بولا۔ "اگر وہ ہم میں سے نہیں تھا تو پھر کون میں سے تھا اور کس مقصد سے ہمارے ساتھ لگا ہوا تھا اس کا یوں کیا ایک ثابت ہو جائے..... یوں کیا ایک ثابت ہو جائے..... یوں کیا ایک ثابت ہو جائے..... یوں کیا ایک ثابت ہو جائے..... وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ ایک دوسرے کو سمجھنے لگے جیسے سوچ میں پڑ گئے ہوں کہ آفریقا ہوا چلتے چلتے یوں ثابت ہو جائے کیوں؟ کیسے؟ کس لئے؟"

آخری بار بارش آدی نے حوصلہ پکڑا اور کہا کہ "عزیز دہشت مت کر کہ دہشت میں ہمارے لئے غالت نہیں ہے۔ وہ بے شک ہمیں میں سے تھا مگر یہ کہ جس قیامت میں ہم گھروں سے نکلے ہیں اس میں کون کس کو پہچان سکتا تھا اور کون کس کو کٹا کر سکتا تھا۔"

"کیا ہمیں یہ یاد نہیں؟" تو جو ان پھر اس کا کیا۔ "کہ جب ہم چلے تھے تب کہتے تھے۔ اور کہاں سے چلے تھے۔" تو جو ان نے نکڑا

لگایا۔

بارش آدی نے اپنے ذہن پر زور ڈالا۔ پھر بولا۔ "مجھے بس اتنا یاد ہے کہ جب میں غرناطہ سے نکلا ہوں....."

"غرناطہ سے؟" ایک دم سب چونک پڑے اور بارش آدی کو تعجب سے دیکھنے لگے۔ پھر قہیلے والے نے زور زور سے ہنسا شروع کر دیا۔ بارش آدی سب کے چونک پڑنے پر ہنستا ہنستا بولا۔ "اب اس غشی سے بالکل ہی ہنستا گیا۔ وہ فتنے ہار ہاتھ پھر بولا۔ "یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ میں ہاتھ لگوں کہ جب میں جہاں آ یاد سے نکلا ہوں تو....."

"جہاں آ یاد سے؟" پھر سب چونک پڑے۔

قہیلے والا غور سے کہا ابھی تک بارش آدی پر فتنے ہار ہاتھ ہنستا کر چپ ہو گیا۔

تب ڈیڑھ سوا گھنٹہ اور رات دہشتی ہنسا میں اکھڑ چکا ہوں۔ اب میرے لئے یہ یاد رکھنے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں غرناطہ سے نکلا ہوں یا جہاں آ یاد سے نکلا ہوں یا ریت المقدس سے اور یا کشمیر سے....." کہتے کہتے دور کا۔

ڈیڑھ سوا گھنٹہ کی اس بات سے عجب سے طرح حائر ہوئے کہ چپ سے ہو گئے مگر بارش آدی آبدیدہ ہوا اور یہ کام زبان پر لایا کہ "ہم اپنا سب کچھ چھوڑ آئے تھے مگر کیا ہم اپنی یادیں بھی چھوڑ آئے ہیں۔"

قہیلے والا آدمی بہت سوچی کر بولا۔ "مجھے اب اس قدر یاد ہے کہ ہمارے گھر دہشت درجہ مل رہے تھے اور ہم باہر نکل رہے تھے۔" بھاگ رہے تھے۔

تو جو ان کا دل بھرایا۔ بولا۔ "مجھے بس اتنا یاد ہے کہ اس وقت میرا باپ ہاتھ مار پھینکا تھا اور ہاتھ میں اس کے قہقہے تھے ہونٹ اس کے مل رہے تھے اور گھروں میں دھواں ہی دھواں تھا۔"

بارش آدی نے رات بھری آواز میں کہا۔ "میرا باپ یہ کچھ دیکھنے کے لئے زور دیا۔"

تو جو ان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈھارے تھے۔

قہیلے والا بہت سوچی کر بولا۔ "مجھے اب اس قدر یاد ہے کہ گھر دہشت درجہ مل رہے تھے اور ہم سراسر دہشت درجہ مل رہے تھے۔"

ڈیڑھ سوا گھنٹہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بولا تو یہ بولا کہ دوست یادوں میں کیا رکھا ہے۔ میرے لئے یہ یاد رکھنے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میرے سر پہ بلغم پڑا تھا یا انجلی پڑی تھی یا اسے حواری نے دو نیم کیا تھا۔ میرے لئے اصل بات یہ ہے کہ اس وقت میرا سر پہ بلغم پڑا تھا یا

ہے اور خون اس سے انورس رہا ہے۔

سب جھوڑا ڈنگی سر کو پکھنے لگے۔

بارش آدی سروالے کو نکٹا رہا پھر یوں کہ "میرا سینہ تیرے سر سے زیادہ ڈنگی ہے" آہ سرد بھری۔ پھر یوں کہ "کیا بقیہ جی کہہ لیں گئی۔"

"کیا غلط جی کہہ کر گئی۔" قہیلے والے نے بھی ہنسا سانس بھرا۔

"کیا صورت جی کہ نظر اُس سے اچھل ہو گئیں۔" تو جوان افسردہ ہو کر یوں کہ "وہ یادوں ہی یادوں میں دور تک گیا اس ساعت تک جس ساعت اس نے اپنی زندگی کا پہلا بوسہ کسی اب پر قبضہ کیا تھا اور اس نے وہ اطلاعات کے جوں جوں ساعت میں کئے جاتے ہیں کہ اس ساعت میں تو وقت اور ماحول دونوں بچے دکھائی دیتے ہیں اور صحت کا راستہ چاہوں ان نظر آتا ہے۔

اس ساعت کو اس نے ایک ادا کی کے ساتھ یاد کیا۔ پھر بڑبڑایا۔

"اگر وہ اس وقت یہاں ہوتی تو ہم پرے ہوتے۔"

"ہوتی؟" بارش آدی نے اسے تعجب سے دیکھا "کون ہوتی؟"

"وہ"

"وہ کون؟"

تو جوان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ٹھگی ہانڈے غلامیوں دیکھ رہا تھا۔ بارش آدی اور قہیلے والا اسے غور سے دیکھتے رہے۔ ڈنگی سروالے نے درخت کے تنے سے لٹک دکائی اور آنکھیں موند لیں جیسے وہ اس سارے قصے سے تھک گیا ہے۔ قہیلے والا تو جوان کو دیکھتا رہا پھر آہستہ سے یوں کہ "کیا وہ عورت جی؟"

"عورت؟" بارش آدی چونک چڑا۔

ڈنگی سروالے نے بھی چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"اگر وہ عورت جی؟" قہیلے والا یوں کہ "تو خدا کی قسم ہاں ایک اچھے ہم سفر سے محروم ہو گئے ہیں۔"

بارش آدی نے قصے سے اسے دیکھا اور کہا "اگر وہ عورت جی تو خدا کی قسم اس کی ہم سفری میں بہت خراب کرتی۔"

ڈنگی سروالہ حلقہ بنی ہنسا اور کہا۔ "اب ہم خراب نہیں ہیں؟"

"مگر وہ خرابی در خرابی ہوتی۔"

تب ڈنگی سروالے نے کسی قدر درشت لہجہ میں اسے مخاطب کیا "اے بوڑھے آدمی عورت کی بدولت خراب ہو نا اس سے بہتر ہے کہ ہم بلا سبب جادو خراب پھریں۔" پھر اس نے آنکھیں موند لیں اور سر سے پر لگا دیا۔

دیر تک خاموشی رہی۔ قہیلے والے نے آس پاس سے اچانک منہ بند کیا اور لاکھوں ڈال دیا۔ چپ چاپ اپنے خیالوں میں گم اپنے اپنے دوسلوں میں غلطیاں وہ بیٹھے رہے پھر بارش آدی بڑبڑایا عجیب بات ہے نہ اس کا نام یاد رہا نہ صورت یاد رہی نہ یاد رہا نہ وہ عورت جی یاد رہا۔

قہیلے والا زبان پر زور ڈالتے ہوئے کہنے لگا "بھئی کس آقا کہ کون آدمی تھا۔ کون ہو سکتا ہے۔"

قہیلے والے نے فک بھرے لہجہ میں کہا۔ "اور ہو سکتا ہے کہ آدمی ہی نہ ہو۔"

"آدمی ہی نہ ہو۔" تو جوان پکھرا سا گیا۔

بارش آدی نے جمل کیا۔ پھر آہستہ سے کہا۔ "ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

اس پر خاموشی چھا گئی۔ مگر تو جوان کہ دوسرے میں پکھنسا گیا تھا یوں کہ "اگر وہ آدمی نہیں تھا تو پھر کون تھا؟"

بارش آدی اور قہیلے والا آدمی دونوں ہی اس سوال پر سوچ میں پڑ گئے۔ ڈنگی سروالے نے آنکھیں کھولیں تو جوان کی دیکھا کہا "اگر وہ عورت نہیں جی تو میری جاسے ہو کون یاد آتی۔" اور پھر آنکھیں موند لیں۔

تھوڑے سے تامل کے بعد بارش آدی نے کہا "عزیز کیا بات کہہ مراد آدمی پر سے ہمارا اعتبار اٹھ جائے۔"

ڈنگی سروالے نے آنکھیں کھول کر بارش آدی کو دیکھا اپنے مخصوص سچا اعداد میں جہاں جہاں اور یوں کہ "اے بزرگ آدمی پر حیرت انگیز ابھی تک قائم ہے۔" پھر اس نے آنکھیں موند لیں اور سر ڈھک کر سنے پر تگ گیا۔

بارش آدی نے اسے تشویش سے دیکھا اور پوچھا "عزیز کیا تیرا سر زیادہ درد کر رہا ہے۔" ڈنگی سروالے نے اسی طرح آنکھیں موندے ہوئے نگلی میں سر ہلایا اور ساکت ہو گیا۔ بارش آدی نے پھر پوچھا "جیسا کچھ یاد ہے کہ جیسا ضرب کس چیز سے اور دم ترے سے کیسے لگے۔"

ڈنگی سروالے نے لاپتہ بھرے لہجہ میں آنکھیں موندے موندے کہا۔ "مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔"

"عجیب بات ہے" تو جوان یوں کہ۔

"کوئی عجب بات نہیں ہے۔" بارش آدی کہنے لگا "چٹ زیا دوشدہ ہوتو داغ سن ہو جاتا ہے اور عاقلہ قعوزی دیر کے لئے معطل ہو جاتا ہے۔"

"میرے سر میں کوئی چٹ نہیں لگی۔" قہیلے والا بولا "بھڑکی مجھے خاصی دیر تک یوں لگا جیسے میرا داغ سن ہو گیا ہے۔"

بارش آدی نے اسے گھمایا "ایسے حالات میں ایسا ہو جاتا ہے۔ آدی دہل جاتا ہے۔" یہ کہتے کہتے بارش آدی چمکا۔ کچھ دیر یوں جس سے حرکت بٹھا رہا جیسے کچھ شے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر سوالیہ نظروں سے قہیلے والے کو دیکھا "یہ وہی آوازیں ہے۔"

قہیلے والا کان لگائے سنا رہا پھر بولا "وہی آواز ہے۔"

تینوں کچھ دیر تک کان لگائے کچھ سنتے رہے۔ پھر انہوں نے خوف بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دیکھتے رہے۔ پھر بارش آدی اٹھ کھڑا ہوا۔ قہیلے والا اور جواں بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب وہ پہلے گئے تو ڈی سروا لے لے آکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔ ایک تکلیف کے ساتھ اٹھ اور پیچھے پیچھے بولیا۔

دور در تک گئے ایک سمت میں پھر دوسری سمت میں۔ پھر وہ جواں ہوئے اور قہیلے والا بولا۔

"یہاں تو دور در تک کوئی دکھائی نہیں دیتا۔"

بارش آدی بولا "نہ کوئی تو ہے نہ جاکر بار بار بھونکتا ہے۔"

"تو پھر کت کہاں ہے؟" تو جواں نے سوال کیا۔

اس سوال پر سب پکرا گئے۔ یہ تو کسی نے اب تک سوچا ہی نہیں تھا کہ کت بھی ابھی تک نظر نہیں آیا تھا۔

قہیلے والے نے کہا "اب کت بھی مصیبت کیا۔"

بارش آدی بولا "میرے کت نہیں ہے آدی ہے۔"

ڈی سروا لے لے بے تعلقی سے نکلا لگا "بھڑکی" ہم دونوں میں فرق قائم رکھ سکیں۔"

بارش آدی نے اس کی بات سن کر ہی کی پھر دفعتاً چلنا "چلو واپس۔"

"کیوں؟"

"زیادہ دور جانا غصے نہیں۔"

اور وہ چٹ پڑے۔ چپ چاپ پہلے رہے اور پھر وہی آکر پسر گئے جہاں سے پہلے تھے۔ تو جواں نے بیٹھے ہی خوف زدہ

آوازیں کہا "ہم اس کا پیچھا کر رہے ہیں یا وہ مارا پیچھا کر رہا ہے۔"

"وہ مارا پیچھا کر رہا ہے۔" قہیلے والے آدی نے ڈی ہوئی آوازیں کہا۔ "یہ تجھے کیسے گمان ہوا۔"

"مجھے یہ ایسے گمان ہوا کہ جب ہم واپس آ رہے تھے تو لگا کہ کوئی پیچھے پیچھے مل رہا ہے۔"

"تو نے مڑ کر دیکھا؟"

"نہیں۔"

بارش بزرگ نے اسے داد دی "تو جواں بچہ نے اچھا کیا۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہیے۔" ڈی سروا لگا کر آتے ہی تھک کر لیٹ گیا تھا یہ سن کر دفعتاً اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جواں کو دیکھا۔ پھر بولا۔ "یہ تو میرے ساتھ بھی ہوا تھا جب میں اسے اٹھانے گیا تھا تو بیٹھے ہوئے مجھے لگا کوئی لمبے لمبے ڈگ بھرتا پیچھے آ رہا ہے۔"

بارش بزرگ نے تشویش سے کہا "مخمر بڑ تو جی اسی وقت تانا چاہے تھا۔"

"میں تو بھول ہی گیا تھا اب نو جواں کے کہنے پر یاد آیا۔" کہتے کہتے ٹھٹھکا اور سوچ میں پڑ گیا۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"غصہ یاد کر لینے دو۔" یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر گویا کام ہو کر "مخمر بڑ تو جی یاد ہوتا تھا جب میں گمن رہا تھا تو میں نے اپنے آپ کو کت تھا یا نہیں سن تھا۔"

"اپنے آپ کو؟" قہیلے والے نے پکرا کر کہا۔

ڈی سروا سوچتا رہا۔ پھر بولا " شاید میں نے اپنے آپ کو نہیں سنا تھا۔۔۔۔۔ ہاں بالکل۔ میں اپنے آپ کو کت گنا بھول ہی گیا تھا۔"

تینوں اس پر پکرا سے گئے ہوئے "اچھا پھر؟"

"تو پھر یوں ہے کہ جہاں ایک آدی کم ہے وہ میں تھا۔"

"تو؟" سب نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں میں۔"

یہ بات سن کر سب تانے میں آ گئے اور ڈی سروا لے لے نکلتے گئے۔ پھر نو جواں دفعتاً چمکا۔ اسے یاد آیا کہ گھٹنے ہوئے اس نے بھی اپنے آپ کو نہیں سنا تھا اور اس نے کہا کہ "جہاں آدی کم ہے وہ میں ہوں۔"

یہ کام سننے سننے قہیلے والے آدمی نے یا دیکھا کہ کتنے ہوئے تو اس نے بھی خود کو نہیں سنا تھا۔

اس نے سوچا کہ کم ہو جانے والا آدمی وہ ہے۔ پارٹیش آدمی دیر تک غرق میں لٹا رہا۔ پھر وہ بعد مذہب کے یہ حرف زبان پر لایا کہ "عزیز دو مجھ سے چوک نہیں ہونی چاہیے حتیٰ کہ مجھ سے بھی ہوئی میں کتنے ہوئے سب کو نا" مگر خود کو فراموش کیا۔ تو جی ایک آدمی کم ہوا ہے وہ یہ بندہ کترین ہے۔"

جب سب پھر میں پڑ گئے اور یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ آخروہ کون ہے جو کم ہو گیا ہے۔ اس آن ڈی سدا کے پھر وہ وقت یاد آیا جب کم ہو جانے والے آدمی کو صوفیہ کرپٹ رہا تھا کہنے لگا۔ "اس وقت مجھے لگا۔" اس وقت مجھے لگا کہ وہ آدمی تو نہیں کہیں ہے مگر میں نہیں ہوں۔"

پارٹیش آدمی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "عزیز تو ہے۔" یہ سن کر ڈی سدا نے ایک ایک ساتھی کو یوں دیکھا جیسے اسے پارٹیش آدمی کے بیان پر اعتبار نہیں آیا ہے۔ ایک ایک ساتھی نے اسے یقین دلایا کہ وہ ہے۔ جب اس نے فطرتاً سانس بھرا اور کہا کہ "چونکہ تم نے میری گواہی دی اس لئے میں ہوں۔" انہوں نے کہا کہ اب دوسروں کی گواہی پر زندہ ہوں۔"

اس پر پارٹیش آدمی نے کہا۔ "اے عزیز شکر کر لے تیرے لئے تین گواہی دینے والے موجود ہیں۔ ان لوگوں کو یاد کرو جو تھے مگر کوئی ان کا گواہ نہ سارو نہیں رہے۔"

ڈی سدا ہوا "سو اگر تم اپنی گواہی سے پھر جاؤ تو میں بھی نہیں رہوں گا۔"

یہ کام سن کر پھر پھر اٹھے اور ہر ایک دلی عمل میں یہ سوچ کر ڈرا کر کہیں وہ وہ آدمی نہیں ہے جو کم ہو گیا ہے اور ہر ایک اس لحاظ میں پڑ گیا کہ وہ کم ہو گیا ہے تو وہ ہے یا نہیں ہے۔ دلوں کا خوف آنکھوں میں آیا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ڈرتے ڈرتے اپنا اپنا شک بیان کیا۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کا حوصلہ بندھا یا اور ایک دوسرے پر گواہ بنے ایک دوسرے سے گواہی لے کر اور ایک دوسرے کی گواہی دے کر مطمئن ہو گئے مگر نو جوان پھر شک میں پڑ گیا۔ "یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ چونکہ ہم ایک دوسرے پر گواہ ہیں اس لئے ہم ہیں۔"

ڈی سدا اٹھا۔ "فیوض نے پوچھا کہ اسے یاد کرو کیوں نہ نہ۔ اس نے کہا کہ "میں یہ سوچ کر جیسا کہ میں دوسروں پر تو گواہ بن سکتا ہوں مگر اپنا گواہ نہیں بن سکتا۔"

اس کام نے پھر سب کو بھرا دیا۔ ایک دوسرے نے ان سب کو گھیرا اور ان سب نے سترے سے اپنے آپ کو گھنا شروع کر

دیا۔ اس بار ہر کتنے والے نے کتنے کا آغاز اپنے آپ سے کیا مگر جب گن چکا تو گڑ بڑا گیا اور باتوں سے پوچھا کہ "کیا میں نے اپنے آپ کو گھنا تھا؟"

ایک نے دوسرے کو دوسرے نے تیسرے کو اور تیسرے نے چوتھے کو گڑ بڑا دیا۔ آخر نو جوان نے سوال کیا کہ "ہم تھے کتنے؟" اس سوال نے دلوں میں راہ کی ہر ایک نے ہر ایک سے پوچھا "آخر ہم تھے کتنے؟" پارٹیش آدمی نے سب کی سنی۔ پھر یوں گویا ہوا کہ "عزیز دو میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب ہم چلے تھے تو ہم میں کوئی کم نہیں تھا۔ پھر ہم کم ہوتے چلے گئے۔ اتنے کم ہوئے اتنے کم ہوئے کہ راہ گئیں ہو گئے جا سکتے تھے۔ پھر ہمارا اپنی اگلیوں پر سے اعتبار اٹھا گیا۔ ہم نے ایک ایک کر کے سب کو گھنا اور ایک کو کم پایا۔ پھر ہم میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی چوک کو یاد کیا اور اپنے آپ کو کم پایا۔"

نو جوان نے ایک ایک کے ساتھ کہا "تو کیا ہم سب کم ہو گئے ہیں؟"

پارٹیش آدمی نے نو جوان کو دیکھا جو کچھ سے دیکھا جو کچھ ہوئی اور کو پھر الجھا دے رہا تھا۔ "کوئی کم نہیں ہوا ہے۔ ہم پورے ہیں۔" نو جوان نے آنکھوں پر سے ہر سوال کیا "ہم کیسے ہائیں کہ ہم پورے ہیں۔ آخر ہم تھے کتنے؟"

"کب کتنے تھے؟" پارٹیش آدمی نے برہم ہو کر پوچھا۔

"جب ہم چلے تھے۔"

ڈی سدا نے نو جوان کو گھور کر دیکھا "ہم کب چلے تھے؟"

نو جوان ڈی سدا کے لئے کھینچا۔ پھر اس کی آنکھ میرا آئی۔ "یہ کچھ یاد نہیں پڑتا کہ کب چلے تھے۔ بس اتنا یاد ہے کہ مگر میں دھواں اٹا ہوا تھا اور میرا پاپ اس کھڑی جا نماز پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ مل رہے تھے اور اگلیوں میں شمع کرش کر رہی تھی۔"

ڈی سدا نو جوان کو کھانگی ہانڈ سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بڑی حسرت سے کہا "نو جوان تھے بہت کچھ یاد ہے مجھے تو اب کچھ بھی یاد نہیں۔"

نو جوان نے افسردہ ہو کر کہا "مگر مجھے بالکل یاد نہیں آتا کہ وہ اس وقت کہاں تھی۔" پارٹیش آدمی آہ بڑھاتا ہوا "کاش" ہم یاد کر سکتے کہ ہم کہاں سے کب لٹے تھے اور کیسے لٹے تھے؟"

"اور کیوں لٹے تھے؟" نو جوان نے انکار لگایا۔

اور کون سا موسم تھا اور کون سی مہینہ تھی۔

"ہاں اب یہ یاد کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کون سی ساعت تھی اور وہ کون سی مہینہ کے چہرے۔" ہارٹل آدی نے لٹٹا ساٹس بھرا۔ "پھر بھی اچھا ہوتا اگر تم یاد کر سکتے کہ تم کب گئے تھے اور کہاں سے گئے تھے۔" "نوجوان نے نکڑا لگا دیا۔

"ہاں یہ بھی کہ کیوں گئے تھے۔"

"اور یہ کہ" نوجوان نے مزید نکڑا لگا دیا "جب ہم گئے تھے تو کتنے تھے۔"

ہارٹل آدی نے نوجوان کو کھانے کے لیے پیش کیا۔ "ہم اس وقت پرے تھے۔" نوجوان نے ہارٹل آدی کی بات غور سے سنی

پھر بوجھا "کیا وہ گئے وقت ہمارے ساتھ تھا؟"

"کون؟" ہارٹل آدی نے جواب دیا۔

"وہ جو ہم میں سے کم ہو گیا تھا؟"

"وہ؟" ہارٹل آدی نے نوجوان کو دیکھا "وہ کوئی نہیں تھا۔"

کوئی نہیں تھا؟ اچھا پھر سب تب میں پڑ گئے۔ عجیب بات ہے کہ وہ کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک نے دوسرے کو اور دوسرے نے

تیسرے کو دیکھا۔ سب کی آنکھوں میں حیرت تھی اور خوف تھا اور کم سے کم ایسے جیسے اب بھی نہیں ہو سکتے۔

نوجوان نے تھوڑی سی جھنجھکی اور کان کھڑے کئے۔ کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا اسے کچھ دوسرا کان بھی کھڑے ہوئے۔

سب کان لگائے ہوئے تھے اور کچھ سننے کی کوشش کر رہے تھے۔

"کوئی ہے؟" نوجوان نے سرگوشی میں کہا۔

"ہاں ساتھیوں اکوٹی ہے۔ جب آتا ہو تبکہ رہا ہے۔" قہیلے والے نے کہا۔

چاروں ایک دوسرے کو کھنکھنے لگے۔ پھر نوجوان نے آہستہ سے کہا "کیں وہیں نہ ہو؟"

"کون؟"

"وہی"

ہارٹل آدی نے غور کرنا نوجوان کو دیکھا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر دھڑلے لٹٹا کھڑا ہوا اور دوسرے بھی اٹھ کھڑے ہوئے جس طرف سے

آواز آتی تھی۔ پھر اسی طرف سب چل کھڑے ہوئے۔



"ہاں اور کیوں گئے تھے۔" ہارٹل آدی نے تائیدی لہجہ میں کہا جیسے یہ بات اس کے ذہن سے اتر گئی تھی اور نوجوان نے یاد دلوائی ہے۔

نوجوان ہلکی ہلکی گھبراہٹ میں لٹٹا ہوا گیا۔ کہنے لگا اگر میں واقعی جہان آباد سے نکلا تھا تو مجھے بس اتنا یاد ہے کہ رات برسات کی گزری تھی اور کل آج کے بارشوں سے چابلی تھی اور جھولا ہمارے آگن والے نم سے اتر چکا تھا۔" یہ کہتے کہتے وہ خیالوں میں گھبرا گیا۔ لہجہ دھیمہ ہو گیا جیسے اپنے آپ سے باتیں کرتا ہو "مگر وہ تو جھولا اتر جانے کے بعد بھی ہمارے گھر آتی رہی تھی" خیالوں ہی خیالوں میں وہ دور تک گیا۔ سادوں میں بیٹھنے ان دنوں تک جب آگن میں کھڑے ہوئے اس کھنکھنے سے پہلی پہلی غولیاں ہی غولیاں بکھری پڑی راتیں اور جھولے میں چہرہ کر وہ لہجے جھوٹے لگتی اور گاتی تھی وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر کھٹک گیا اور لولا "کچھ یاد نہیں آتا کہ ہمارے گھر آتی رہتی تھی یا نہیں بالکل گھر اس روز کہاں تھی وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر کھٹک گیا اور لولا "کچھ یاد نہیں آتا کہ اس روز وہ کہاں تھی۔"

ڈھکی سروا لہجہ نوجوان کو گنگلی بنا دیا۔

قہیلے والا آدی بولا "اگر تو جہان آباد سے نکلا تھا تو؟"

"یعنی؟" نوجوان نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"مثلاً جیسا کہ ہمارے بزرگ نے کہا کہ ہم فریڈ سے گئے ہوں تو؟" قہیلے والے نے یہ بات ایسے لہجہ میں کہی جیسے وہ بہت محترم

تیز بات ہو اور جیسے وہ ہارٹل آدی کا مذاق اڑا رہا ہو نوجوان تذبذب میں پڑ گیا "فریڈ سے؟" سوچا رہا۔ پھر انیس کے ساتھ

کہنے لگا۔ "اگر میں فریڈ سے نکلا ہوں تو پھر مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔"

"اگر تم فریڈ سے گئے ہیں۔" ہارٹل آدی نے دہلے لہجہ میں کہا اور سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کہنے لگا "مجھے یاد آتا ہے کہ ابھی صبح کا

دھندلا تھا اور دھندلا ہوا تھا۔"

قہیلے والا بے ساختہ ہنسنا۔ مسکراتی ہنسنا۔

قہیلے والا بے ساختہ ہنسنا۔ مسکراتی ہنسنا۔

ہارٹل آدی شہکار چپ ہو گیا۔ نوجوان نے ہارٹل آدی کو دیکھا جیسے کچھ نہ سمجھا ہو۔ "مسکراتی؟" بڑبڑایا اور چپ ہو

گیا۔

ڈھکی سروا لہجہ مزہ ہو گیا۔ "میں اکھڑ چکا ہوں۔ اب میرے لئے یہ یاد کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کون سی ساعت تھی

چہترے کے سکوت کا جزئی جہاز جاری تھی۔ مرزا صاحب کچھ اس انداز سے کہ بہت دور نکل گئے تھے اور اب ایک ساتھ واپس آئے ہیں بھرے ہوئے سوار یاں غم سڑنٹ، ریل چل اٹھی سڑک کو اب طبیعت ہی نہیں لیجی۔ ایک سڑ باتی ہے سو وہ بے سواری کا ہے۔ وقت آئے گا چل کھڑے ہوں گے۔۔۔۔۔“ مرزا صاحب نے فطرتاً سانس لیا اور چپ ہو گئے۔

شجاعت علی کے سلیب بالوں سے ڈھکے ہونٹوں میں جتنے کی ہے اسی طرح دینی تھی اور گزرو گزری آواز جاری تھی۔ بھر شرفائین لے ہوئے اندر سے نکلا اور اس کے ساتھ اندھیرے ہوتے ہوئے چہترے پہ بگلی کی روشنی اور روشنی کے ساتھ دھیمی سی حرکت پیدا ہوئی۔ کوئے میں اسٹول اٹھا کر مڑھوں کے قریب رکھا۔ اس بالین اور دنی اور تیزی کی۔ شجاعت علی نے جتنے کی ہے آہستہ سے مرزا صاحب کی طرف مڑ دی۔ مرزا صاحب نے ایک گھونٹ لیا مگر فوراً ہی نے کو ہونٹوں سے الگ کر کے چلم کو کھینچے گئے۔ ”فطرتی ہو گئی“ دھیرے سے بولے اور بھر اٹھی آواز سے شرفائین کا ”شرفاں میں کوئے ڈال کر لاکھیا کو بھی تازہ رکھ دیجئے۔“

شجاعت علی نے مڑھوں کے بغیر کسی وجہ کے ذرا پیچھے کوس کر لیا کسی جہاں کی اور دھیرے دار چہرے سے ہاتھ جارتے ہوئے بولے ”مرزا صاحب آپ کچ کہتے ہیں کہ اب پہلے سے سڑنٹ رہے مگر سڑنٹ سڑنٹ بے نکل گاڑیوں کا ہوا چل گاڑیوں کا۔“

”رہل گاڑی کے سڑنٹ بھی۔۔۔۔۔“ مسخوڑ مسین نے جانے کیا کہنا چاہتا تھا۔ لیکن شجاعت علی نے اس کا امور اٹھرا چلا لیا اور آگے خود چل پڑے۔ ”ہاں صاحب رہل گاڑی کے سڑنٹ میں جب جب منزل آتی ہے اور طرح طرح کے آدمی سے پالا پڑتا ہے۔“

”اور بعض بعض صورت تو میں میں ایسی کھاتی ہے کہ بس نقش ہو جاتی ہے۔“ مسخوڑ مسین کو ایک بھلا بھلا سراہا دے آیا تھا چنانچہ واقعہ سنا شروع کر دے آخر بندھ میاں نے بھی اچھی خاصی لمبی داستان سنائی ہے۔ ساتھ ہی اسے جب سامی ہوا کہ اسے دن گزر گئے۔ اور اس واقعہ کا ذکر تک اس کی زبان پر نہیں آیا۔ مگر اب سنا نے میں کیا مرتب ہے۔ دو سو چنے لگا پتہ تو دہرمانی گزر گیا نہ وہ مر ہے کہ لوگ نہیں اور طرح طرح کے قلب کریں۔ وہ دن ان کو نہ لے لگا تھا کہ بندھ میاں پتہ سے ہل پڑے ”تی میں صورت کھینچنے کی بھی اچھی رہی۔ جو لوگ بسرا بڑا یا اندھ کے کمرے میں مشق کرنے کے لئے سڑ پہ لگتے ہیں وہ بھی خوب لوگ ہوتے ہیں۔ کیا خوب گو یا غم مشق بھی محتاج روزگار ہوا۔“

”میاں یہ بات نہیں ہے۔“ شجاعت علی کہنے لگے ”بات یہ ہے کہ رہل گاڑی تو پورا شہر ہوتی ہے۔ دو چار آدمی مسافر تو نہیں ہوتے۔ ہر اسٹیشن پر سیکڑوں آدمی اتار تے اور سیکڑوں آدمی چڑھتا ہے طرح طرح کا آدمی رنگ رنگ کی کھڑکی۔ غرض ایک خلقت ہوتی ہے اور کھڑے سے کھڑا چلتا ہے۔“

کٹا ہوا ڈپا

”تو بھائی صاحب یہ کہنے کی باتیں ہیں سڑنٹ میں کچھ نہیں رکھا۔“

بندھ میاں کی داستان بڑی دلچسپی سے سنی گئی تھی لیکن یہ محاکہ شجاعت علی کو پسند نہیں آیا۔ کہنے لگے ”خیر یہ تو نہ کہو آخر بڑے بڑھوں نے بھی کچھ دیکھا ہی تھا کہ حرکت کو برکت دیتے تھے۔ جہاڑی کیا مڑھ اور کیا تجربہ ایک سڑک اور ڈرا سے نقصان سے ایسا کٹا کھا یا کہ سڑک کھانے کا سودا کچھ پیٹے۔ میاں تم نے کچھ پچھو سڑک یا نہیں۔ سڑ اور چڑ ہے۔ کیوں مرزا صاحب؟“

مرزا صاحب نے جتنے کو ہونٹوں کی ہے سے آہستہ الگ کیا مندی ہوئی آنکھیں کھولیں ٹھکھارے اور بولے ”شجاعت علی تم آج کل کے لڑکوں سے غصے ہو۔ ان غریبوں کو کیا پتہ کہ سڑک یا ہوتا ہے۔ رہل گاڑی نے سڑی کو ختم کر دیا۔ چلک پھینکتے منزل آ جاتی ہے۔ پہلے منزل آتے آتے ملطخیں چل جایا کرتی تھیں اور واپس ہوتے ہوتے بیٹے جن کا آگیا کچھ کھلا چھوڑ گئے تھے آپ ہن چکے ہوتے اور سڑنٹوں سے برکی لگتیں ملطخاں اٹھرتے۔“

بندھ میاں نے سلطنت کی بات پکڑ لی اور کہنے لگے ”مرزا صاحب آج تو ملطخیں بھی چلک پھینکتے چل جاتی ہیں۔ اطمینان سے نکل کر چل گاڑی میں سوار ہونے لگا اسٹیشن آیا تو اخبار دان چادر پہ کیوں بھائی کیا ہوا کہ کسی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔“

مرزا صاحب رجوت بولے ”حکومت ہی کا تختہ الٹا ہے سکرٹو نہیں پڑا۔ آگے سک بول جایا کرتا تھا۔ بھائی دوسر ہوتا تھا۔ قیامت کا سڑ ہوتا تھا۔ سیکڑوں میل آگے سیکڑوں میل پیچھے دس اوچل منزل تم لگتا کہ آخری سفر ہے۔ کبھی شیر کا ڈر نہیں کیڑے کا خوف۔ چٹوں ہٹ ماروں کا خدشہ پڑنے چلا دوں کا اندیشہ۔ ان دنوں نہ جہاڑی کھڑی تھی نہ بگلی کی روشنی اور پتارے سے بے خطر نہ رہ جاتی ہوئی ملطخیں۔ کوئی مشعل اچانک سے بھج جاتی اور دل دھک سے روہ جاتا۔ کبھی کبھی تارونٹا اور آسان پر بھی کبھی کبھتی چل جاتی۔ دل دھڑکنے لگتا کہ ابھی خیر مسافت میں آ رہا تو کچھ دیکھو۔ رات اب گھٹنوں میں گزرتی ہے آگے مرے گزر جاتی تھیں اور رات نہیں گزرتی تھی۔ رات ان دنوں پوری صدی ہوتی تھی۔“ مرزا صاحب چپ ہو گئے۔ بندھ میاں اور مسخوڑ مسین بھی چپ تھے۔ شجاعت علی کے ہونٹوں میں جتنے کی ہے سکت ہو کر وہ گزرتی تھی اور گزری آواز بغیر کسی تشبیہ و فراز کے اٹھ کر اندھیرے ہوتے ہوئے

بڑے امیروں تک نے ریل نہیں دیکھی تھی بلکہ بہت سوں نے نام تک نہیں سنا تھا۔

مختور مسین واقعہ نہیں آواز سن رہا تھا۔ وہ شہادت ملی کا منہ نہ کھاتا تھا کہ ریل گاڑی کہاں سے آئی۔ پھر چروہ دھندلا پڑنے لگا اور آواز بھی روشن نظر اور روشن ہو گیا تھا۔ منور ہوتے ہوئے گھوٹے اور گھرنی ہوئی چنگ دار گھیریں۔ ایک ریل کی پٹری تھی جس کا سب سے دور دور کی روشنی کے تقصیر والے مجھے کھڑے تھے۔ مجھے کے ہالے کا چھٹکا ہوا تھا اور اس کے پھر دی سنم تار کی اندھیرے میں گم ہوتی ہوئی کالی آتشی پٹریاں۔ اس نے اوپر کی ہر جگہ پہنچا ہوا اندھا دکھا تھا بچے کی ہر قسم سے مسافر جگہ ایک ریل پر تھے مسافر جو تھکتے ہوئے مسافروں کی پانچ کھڑکی سے ریل کے اگلے گھٹنے گھٹنے چپک کے چلے دے لے سوتے ہوئے مسافروں پر نظر ڈالتے اور پھر اٹھتے گھٹنے گھٹنے ان گھٹائشیں آئے اور گزر گئے۔ ان گھٹائشیں ریل گاڑی کی رفتار دیکھتی پڑتی تھی اندھیرے ڈبے میں اہل ہوا پھر والوں اور قیوں اور گھٹنے بڑھتے مسافروں کا شور بلند ہوا سنی سنی کے ساتھ جھلکا کھڑا ریل چل چلا پڑی۔ چلتے چلتے پھر دی کیفیت جیسے اس کا پڑ گزری سے بھڑک کر ایسا کھڑا کر گیا ہے اور گزرتی دیتی شور مچاتی اور رات جانے کب شروع ہوئی تھی اور کب ختم ہوئی۔ کالی صدی آدھی گزرتی ہے اور آدھی باقی ہے اور ریل آگے چلنے کی بجائے پھرتی رہی ہے۔ کبھی کبھار ہی ہے۔ ریل تو لگا کر دی کھڑی رہے گی اور ساری رات کھڑے کھڑے گزارے گی۔ چلتے ہوئے گھٹنا کر رات کے ہم دوش ای طرح دوڑتی رہے گی اور رات کبھی کبھی ہمارے گی۔ چلتے چلتے پھر ای انداز سے رات کا دھما پڑا تو گویا چلتے چلتے ٹھک گئے ہیں۔ اندھیرے ڈبے میں بچھلتی ہوئی روشنی کی بیٹیاں مسافروں قیوں اور پھر دی والوں کا شور بلند کے نشے سے چوکتی ہوئی کالی آواز "بھٹنٹن ہے؟" اور خود ہی میں ڈوبتا ہوا کوئی اور صورہ "نہیں کوئی چھوٹا آئینہ ہے۔" سنی سنی کے ساتھ جھلکا کھڑا لکنا سہ سے چلتے ہوئے بیٹوں کا بھاری شور۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ صرف لڑے دو سوچنے لگا۔ ان گھٹنا پڑا کھٹکی اور ان گھٹنا پڑا کھٹکی کھٹکراتی ہی باقی تھی بلکہ اور کسی ہو گئی تھی۔ اٹھنا نہ لے کر اٹھا اور چلے آکر چوٹا چٹا خانے کی طرف چلا۔ چلے چلے پھر دی والوں اور قیوں کھٹک کوٹ والا غصہ اٹھتے اٹھتے سو گیا تھا خرابانے لپٹے لگا اور دو سالوں صورت خود کو کے نشے میں ڈوبی ہوئی کھڑکی سے لگا ہو اسٹری کی کیفیت پیدا کر رہا تھا چنگ دار بال ہوا سے اڑا کر چہرے پر آ رہے تھے اور ساڑھی کا پد بھرے ہوئے سینے سے ڈھلک کر نیچے آ رہا تھا۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ ڈبے میں خاموشی تھی۔ مسافر سو رہے تھے اور گاڑی ای ایک رفتار سے اندھیرے میں بھاگ رہی تھی دوسرے کو نشے میں ایک غصہ جس نے گزری کی وجہ سے خیانت تک اتار دیا تھا چنگ دار کھٹک کے نیچے گیا۔ "کالی ندی آ گئی۔" اور بیٹوں کے بڑھتے ہوئے شور کے ساتھ گاڑی ایک رنگ میں داخل ہوئے تھی۔ وہ جہاں کتاہا کھڑا تھا اور ریل اندھیرے میں داخل ہو رہی تھی۔ ڈبے میں گھپ

"اور جہاں کھوے سے کھوا چلے گا وہاں نظر سے نظر بھی ملے گی۔ اب دیکھنے میں ایک واقعہ سنا ہوں۔" آخر مختور مسین نے بات شروع کر دی۔ بندو میں اس کے تھکاکہ آئیز روئے نے اس کے گرد پڑا تھا لیکن شہادت ملی نے بات پھر چنگ میں کاٹ دی۔ "خیر نظر سے نظر ملنا کون سی بڑی بات ہے یہ کام تو کھوں پر کھڑے ہو کر بھی ہو سکتا ہے سڑی کی اس میں اس کی تھکاکہ ہے۔ سڑی میں تو صاحب وہ واقعہ ہوتا ہے کہ آدھی دنگ رہ جاتا ہے اور کبھی کبھی تو کھوں کی تار بلیں بدل جاتی ہیں۔" شہادت ملی کے لہجہ میں اب گرمی آچلی تھی۔ مرزا صاحب کی طرف مخاطب ہو کر بولے۔ "مرزا صاحب آپ کو وہ زمانہ تو کہاں یاد ہو جب ریل چلی تھی۔ ہمارے آپ کے ہوش سے پہلے کی بات ہے۔ والد مرحوم اس کا ذکر سنا کرتے تھے۔"

مختور مسین انکار دیکھتا رہا کہ کب شہادت ملی بات ختم کر دیں اور کب وہ اپنی بات شروع کرے۔ مگر شہادت ملی تو ایک ہی اور لمبی داستان شروع کرنے سے ہاتھ نہ اٹھاتے تھے۔ پھر اس کی سہ جگہ آپ سی م ہوئے تھی۔ اس نے کئی طریقوں سے اپنے دل کو کھجایا۔ اس اور مختور میں داستان سنا کر کیا اچھے لگے لگا اور اسے پوری طرح یاد بھی تو نہیں۔ بعض کڑیاں بائیں گل ہیں بعض کڑیوں کی کڑی سے کڑی نہیں ملتی۔ ایک بے جا خواب کہ حافظہ میں محفوظ بھی نہیں اور حافظہ سے اتر بھی نہیں ہے۔ پہلے تو اسے وہ بے جا خواب دھندلا دھندلا دکھائی دیا سوائے ایک نقطہ کے جو روشن تھا اور روشن ہوتا جا رہا تھا۔ ایک سالوں صورت۔ روشن نقطہ پہلے لگا تھا۔ اس کے عکس سے ایک سنم تار کی گھڑی کو منور ہوا تھا۔ دینگ روم کی خاموش روشنی میں سو جاتے مسافر۔ بیٹھے بیٹھے وہ گھٹنے لگتا پھر ایک جھپکی سی آتی تھر پھر پھر ایک پاد پڑی پڑی پڑیوں کا بے تھا شور ہوتا اور اسے گاڑی میں دے دے کے باوجود ایک جھپک سا گزرتا کہ شاپہ گاڑی آئی تھی وہ جلدی سے باہر جاتا گزرتی ہوئی کالی گاڑی کو دیکھتا اور پلٹتے قدم کا بے وجہ پھرتے کے بعد پھر اندر آ جاتا پھر آکھ بچا کے سامنے والی چٹائی کو دیکھتا جہاں سلیپ بکھا ہی وصولی اور کھوں تک کے کوٹ میں بیٹوں ایک پھوڑی بالوں بھاری بدن والا شخص بیٹھا تھا اور برابر میں سالو نے چہرے چہرے سے بدن والی کالی کالی کھٹکے اٹھتے اٹھتے اس کے سر سے پٹائی ساڑھی پار بار دھلکتی اور چپکتے کالے بال اور بچے پھٹکے پھٹکے پلے بندے سے جھلکاتے نظر آتے گھٹتے۔

"بندوؤں مسلمانوں دونوں نے بڑا شور مچایا کہ "شہادت ملی ہی جوش سے داستان سناے جا رہے تھے۔" یاں بیروں قیوں کے حصار ہیں۔ دھیں بیٹوں کی ساؤ گھم گھم ریل کی لائن یاں نہیں بچھی۔ مگر صاحب انگریز فرعون سے سامان ہاتھ اٹھا عاقبت کی ٹرین تھا۔ ایک ذہنی اور لائن بن گئی۔ ان دونوں والد صاحب کو کبھی دلی کا سفر دیکھنا ہوا۔" شہادت ملی اٹھتے اور اب اس کی آواز میں ایک آخر کی بوجھ آچلی تھی "ہمارے والد صاحب اس شہر میں پہلے شخص تھے جو ریل گاڑی میں بیٹھے تھے۔ اس وقت یاں کے بڑے

اندھیرا ہو گیا۔ ذہن دکھلا پٹری سے اتر گیا۔

”رہیں جب جتنا ہے تو اپنا کچھ جنگل میں رک کے کھڑی ہو گئی۔“ شہادت علی کی آغا ہادی قسبی ”آدمی مات
 اصر۔ بڑی مصیبت۔ زمانہ غراب تھا۔ ملک میں خیر سے دعوت دے رہے تھے۔ دلی کا یہ حال کہ جتنا کثافت سے لکھنے لکھنے اور موت
 کے کثافات آتے تھے انہیں دیکھا کل پر نہ دیکھے، کوئی قرطبی میں عمر کا موزی نہیں چلتی۔ پہاڑی رات سر پہ گزار دی“ جنگل بھی
 بھیج کر تھا۔ آس پاس آبادی کا نشانہ نہیں کہ جا کے سیرا کر لیں۔ آفریح ہوئی مسج کے ہون میں ڈبے کے ایک کوٹے میں ایک
 سپیڈریش بزرگ نماز میں مصروف نظر آئے۔ سلام پھیر کے انہوں نے ڈبے والوں کی طرف دیکھا اور بولے ”پڑی اٹھو اور۔۔۔“

بندہ ماں شہامت علی کی صورت دیکھنے لگے۔ مرزا صاحب جے کی نے ہنوز میں دانا چاہتے تھے لیکن ہاتھ جہاں کا تھاں رہ گیا اور نے بڑھئی کی گرفت سے بڑھئی منظور حسین اور احمات کی پچھلی کڑیوں کو جوڑنے میں مصروف تھا۔

[illegible]

شہادت ملی کی آواز اُڑا دہونے لگی ذہن پھر چلنے لگا۔ منور نظروں کے بے رہ ہلا مارا کر دیں کر رہی تھی اور منور نے فیسٹل چمیل کر چکنا تصویر یہ بن رہے تھے۔ اندھیری سرگ میں داخل ہوتی ہوئی بے پناہ شور کرتی ہوئی ریل گاڑی جس کے نیچے گاڑ پائی اسٹار ہا تھا اور بکھرے ہوئے سکوں کو سمیٹ رہا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ساتھ اس کی انگلیوں میں دس گھٹیلے گاڑ اور ہاتھوں میں پھول کھیلے گئے۔ ساقی صورت پہنچا ہوا ہوتا ہوا بھرا ہوا گرم بدن۔ اندھیرے میں بکٹی ہوئی اس منور تصویر نے اس کی آنکھوں میں ایک کرن پیدا کر دی تھی جو اندھیرے میں جیسے ہوئے بہت سے گوشوں میں نشو و نما کر رہی تھی انہیں اعمال رہی تھی صبح متا اندھیرے جب وہ اتر کر

پھر وہ سب بچے یا تو اس کی نظروں نرم یعنی نگاہ سے دم بھر کے لئے چھوٹی ہوئی کھڑکی سے باہر پھینکی ہوئی سج کی شاداب آغوش میں جا لگی۔ پھر جب گاڑی بدلتے گئے تو دوسرا بچہ ایسی جھوٹی اور سائلوئی صورت باہر نکلے گا۔ ایک مرتبہ پھر لڑکا ہوں سے لگا ہوا کو چھوگا۔ دوسری گاڑی سامنے دور سے پلٹے گا۔ ہم پھر کھڑکی تھپی اور انجینی سے کالے دو عموں دل کے دل اللہ رہے تھے اور کج کی شک لہذا میں کھیل رہے تھے، افسوس! اور یہ تھے۔ گاڑی نے سٹی وی نظربے ہوئے ہیں میں ایک شواہد ایک حرکت ہوئی اور آگے بڑھتے ہوئے انجین کا کھول چلا کھاتا ہوا اور پڑھنے لگا۔ پھر فوراً ہی دوسری سٹی ہوئی اور اس کی گاڑی بھی چل پڑی۔ تھوڑی دور تک دونوں گاڑیاں سواڑی جاتی رہی پھر پڑیوں میں فاصلہ اور رفتار میں فرق پیدا ہو گیا۔ دو گاڑیاں دور ہوئی گئی آگے لے گئی۔ مسافروں سے سرے اے بے قسم کی تصویریں کی طرح سامنے سے جلدی جلدی گزرنے لگی۔ انجین کی ایک کھڑکی میں سب سے نمایاں سب سے روشن سائلوئی صورت دکھائی دے رہی تھی پاس سے گزرا اور دور ہوتا چلا گیا۔ پڑیوں میں زیادہ فاصلہ اور رفتار زیادہ فرق پیدا ہوا اور وہ گاڑی بچہ کھاتی ہوئی گامزن کی طرح درختوں میں گم ہوئی گئی یہاں تک کہ آخر میں لگا ہوا مال کا بے ڈال اور گاڑی دیر دیر دکھائی دے جا رہا۔ پھر وہ بھی درختوں کی ہریاں میں نکل گیا۔

”اب جو جا کے دیکھتے ہیں تو پنہلی خالی پڑی ہے۔“ پھر وہی شجاعت اور وہی ان کی آواز۔

”اور وہ بزرگ کہاں گئے؟“ بندھوسوں نے حیرانی سے سوال کیا۔

”اللہ بھر جاتا ہے کہاں گئے“ شہادت علی کہنے لگے۔ ”بس وہ کورا کھڑا اسی طرح رکھا تھا۔ مگر پانی اس کا بھی غائب ہو گیا تھا۔“

”پائی غائب ہو گیا؟“ بندہ وہاں نے پھر اسی حیرانی سے سوال کیا۔

”ہاں غائب ہو گیا۔“ شہادت علی کی آواز دھمی ہوتے ہوئے سرگوشی بن گئی۔ ”والد صاحب فرماتے تھے اس کے گلے برس ندر

”جیسا... جیسا میں آگ پر ہی اور اور دلی کی اینٹ سے اینٹ بن گئی۔“

شہادت علی چپ ہو گئے۔ مرزا صاحب پہ سکوت طاری تھا اور بندہ وہاں حیران شہادت علی کو بٹھے جا رہے تھے۔ منظور حسین نے اسکا کہ چینی لی اور حق کو اپنی طرف سرکا لیا۔

”چلم لٹریچر ہو گئی۔“ مہکھور حسین نے چلم کر رہے ہوئے کہا۔

مرزا صاحب نے غلطی اساس لیا۔ ”بس اس کے بھید ہی جانے۔“ اور آواز دے گئے ”اپنے شر کا پھل تو راجازہ کر دے۔“

قصین۔ حضور حسین کی طبیعت میں ایک لہک پیدا ہوئی تھی بڑی بات اس کے لئے ایک تازہ اور تابندہ حقیقت بن گئی۔ اس کا بی چاہہ رہا تھا کہ پوری آب و تاب سے یہ واقعہ سنائے۔ اس نے کئی ایک دفعہ مرزا صاحب کو بھر بندہ دیاں کو بھر شہادت علی کو دیکھا۔ وہ بے چین تھا کہ کسی طرح شہادت علی کی داستان کا اثر زائل ہو اور پھر وہ اندھ بھیلار دے۔ جب جلم بھر کے تھے یہ بھی تو اس نے دو تین گھنٹے کے شہادت علی کی طرف بڑھا دیا "مج تازہ ہو گیا۔" اور جب تھے کی گڑ گڑ کے ساتھ شہادت علی اپنی داستان کی فضا سے واپس ہوتے ہوئے نظر آئے تو اس نے بڑی بے صبری سے بات شروع کی۔

"ایک واقعہ اپنے ساتھ بھی کر رہا ہے بڑا عجیب۔"

شہادت علی حق پیتے میں مصروف رہے۔ ہاں بندہ دیاں نے خاصی دلچسپی کا اظہار کیا "اچھا؟"

مرزا صاحب نے جان کوئی سٹاپ نہ کیس کیا "نظر میں ان کی حضور حسین کے چہرے پر جم گئی تھیں۔"

حضور حسین ٹیٹا سا کیا کہ واقعہ کیسے شروع کرے اور کہاں سے شروع کرے۔ شہادت علی نے حق پرے کر کے کھانا شروع کر دیا تھا۔ حضور حسین نے حق گلت میں اپنی طرف کھینچا اور جلدی جلدی ایک دو گھنٹے لے۔

"ہاں بھئی" بندہ دیاں نے اسے لہکا۔

"اپنی شروع جوانی کا ذکر ہے اب تو بڑی عجیب بات گئی ہے۔" حضور حسین بھر سوچ میں پڑ گیا۔

اب شہادت علی بھی پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

حضور حسین تھے کا گھنٹے لے کے جاؤ جہاں کھائے لگا۔ "ہاں ہوا کہ....." وہ کد بھر سوچنے لگا پھر شروع ہوا جہاں تھا کہ سامنے گلی سے بہت سی لائینیں آتی دکھائی دیں اور آہستہ آہستہ سونے بہت سے قدموں کی چاپ کا دم شور۔ وہ سوائے نظروں سے بڑھتی ہوئی لائینوں کو دیکھنے لگا پھر مرزا صاحب سے مخاطب ہوا "مرزا یہ کیس کے گھر....."

حضور حسین کو فخر مکمل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ سب کی نظریں اس طرف اٹھ گئی تھیں اسے میں شروع گھبراہٹ ہوا لگا۔ مرزا صاحب نے اسے ہدایت کی "شرفو راویک تو کسی جا کے۔"

شرفو راویک اور دیا گیا اور چل چمک آیا۔ "صاحب ہمارے محلے میں کچھ نہیں ہوا۔ بساطیں کی گلی والے ہیں....." حسین رسائی کا لہذا تھا۔

"حسین رسائی کا لہذا؟" بندہ دیاں حیران رہ گئے۔ "اسے تو میں نے صبح کان پر بیٹھ دیکھا تھا۔"

"ہاں بی دو پیر کو اچھا ناسا گھر گیا تھا۔" شرفو کہنے لگا۔ "کھانا کھا یا طبیعت مائل کرنے لگی۔ بولا کہ میرا دل ادا جا رہا ہے۔ اسی وقت چلاؤں دوڑیج ہوئی گھر۔"

"عد ہوئی" مرزا صاحب کہنے لگے "اس نے زمانے میں یہ دل کا مرض اچھا چلا ہے۔ دیکھتے دیکھتے آدمی چل دیتا ہے۔ اپنے زمانے میں تو ہم نے اس کم بخت کا ہم بھی نہیں سنا تھا۔ کیوں بھی شہادت علی؟"

شہادت علی نے فضا سانس لیا اور ایک لمبی سی ہون کر کے چپ ہو رہے۔ مرزا صاحب خود کی سوچی میں ڈوب گئے تھے۔ بندہ میاں اور حضور حسین بھی چپ تھے۔ شرفو کھوار ہاں شاہی اس انگار میں کہ بھر کوئی بات ہو اور پھر اسے اپنی سطوات کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ وہ میاں ہوا کر جانے لگا لیکن جاتے جاتے پھر پلٹا لائین کی حق جیڑ کی جلم کی آگ کریدی بھر بھی سکوت نہوتا تو ہامید ہوا کہ رات پلٹ گیا۔

خاصی دیر کے بعد شہادت علی نے فضا سانس لیا اور تسکین کر بولے "خیر یہ دنیا کے قصے ہیں چلتے رہتے ہیں۔ آج جانا تو آدمی کے دم کے ساتھ ہے۔ ہاں بھی حضور حسین۔"

بندہ دیاں بھی سیدہ ہوئے "ہاں صاحب کیا کہہ رہے تھے آپ؟"

حضور حسین نے پھر یہی لی بولے چہ بھی اندھی بھر کی سوچی میں پڑ گیا۔ "ساری بات ہی ذہن سے اتر گئی....." حضور حسین بڑ بڑایا۔ اس کے ذہن میں ابھرے منور نقطے پھر اندھیرے میں ڈوب گئے تھے۔ ادا بھر کر اکیلا ہی پڑی پکھوار دیا گیا تھا اور رمل بہت دور بہت آگے نکل گئی تھی۔

"اس کے بعد کوئی کہے بھی کیا" اور مرزا صاحب بھر کی سوچی میں ڈوب گئے۔ شہادت علی نے حق اپنی طرف بڑھایا "آہستہ آہستہ دو تین گھنٹے ظہیر ظہیر کے کھانے اور پھر تسلسل کے ساتھ گھنٹ لپٹے شروع کر دیے۔"

حضور حسین کا ذہن خالی تھا۔ خالی ذہن سے مستحکم کشا ہوا تھی کہ لڑکا لانے آیا "ابا بی چل کے کھانا کھا لیجئے۔"

گو یا ایک سہارا کہ حضور حسین فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور چپتر سے سے اترتا ہوا گھر کی طرف ہوا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ گلی کے کنارے والے کھیمے کا فخر روشن ہو گیا تھا جس کے نیچے روشنی کا ایک تھلا سا بن گیا تھا اور اس سے آگے بڑھ کر بھرادی اندھیرا لامعی سے راستہ نکلا ہوا کوئی اندھا نہ حافقہ تاریکی میں لپٹی ہوئی کسی کسی رات گیری کی چاب اندھیرے میں آہستہ سے بندہ ہوتا کوئی اور واڑہ گھر بچنے بچنے تاریک گوشے اور حند لے نکلے پھر نہ ہو گئے تھے اور چلتی بھر کر وٹ لے رہی تھی کہ اندھیرے میں بھیجی اس لائن

کرن کو باہر لایا جائے اس کا اندھیرا یا گھر گھٹ اٹھایا جائے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہوئے پٹا۔" اندھیرا جانا بھی آتا ہوں۔"

اور پھر مرزا صاحب کے چہرے کی طرف ہولیا۔

اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ گلی میں کھینچے والے بچے کا ابھی تھوڑی دیر پہلے گلی کو سر پہاٹے رہے تھے مگر وہ کو چلے گئے تھے ایک وہ ثابت قدم لڑکے تھے جو ابھی تک مسجد کے حام کے اس طاق کے پاس کھڑے تھے جس کے اندر آگ مل رہی تھی اور جس کی دوجار سے کالا سلہ سا کھریج کھریج کر دھوں نے ابھی غاصی بڑی بڑی گولیاں بتائی تھیں۔ لیکن طاق میں ابچند من جل چکا تھا اور آگ نے مندی پڑتی جا رہی تھی جس کی وجہ سے دوجار پہ پگھلا سا ابھی سخت پڑ جا رہا تھا۔ مسجد کے سامنے سے گزر کر منظور حسین گلی میں داخل ہوا اور وہ قدم چل کے چہرے کے سامنے جا پہنچا۔ موٹے سے خالی تھے اگرچہ وہی طرح میں رکھا ہوا تھا اور پٹائی پہ لائیں اسی انداز سے چل رہی تھی۔

"شرفو کہاں گئے مرزا صاحب؟"

شرفو لا! "انہی مٹا دی گزراؤ گئے ہیں۔ آتے ہوں گے جلد ہاؤ۔"

منصور حسین اپنے پہلے والے موٹے سے چاکے بند کیا۔ بیضا رہا۔ بیضا رہا پھر تھے کو اپنی طرف سر کا یا مگر عظمیٰ ہو چکی تھی۔

"ہلکم گرم کر لاؤ گی؟" شرفو لا۔

"نہیں رہتے۔۔۔ بس چلتا ہوں۔"

منصور حسین اٹھ کر اٹھ اور جس راستے آیا تھا اسی راستے مگر کو ہولیا۔



دلیر

کوٹھری کی دیواروں کے نزدیک اندھیرے دیں کی سرحد تھی۔ مٹی میں انی چمکت لگتے ہوئے دل دھرے دھرے دھڑکنے لگتا اور اندر جاتے جاتے وہ پلٹ پڑتی۔ اس کوٹھری سے اس کا رشتہ کئی دفعہ بدلا تھا۔ آگے وہ ایک مانوس بستی تھی۔ مانوس چلنے اندھیرے کی بستی گلی آگھن کی ملتی ملتی دھوپ میں کھینچتے کھینچتے کوٹھری میں کواڑوں کے پیچھے یا پٹلی سے قبلے ایک کے برابر کرنے میں جا بچھا۔ مٹکتے ہوئے پن میں آنکھوں میں اندھیرا اٹھنا بن کے اترنے لگتا اور نکلے جوں سے کی مٹی کی ٹھنڈی ٹھنڈی ٹکڑوں سے لوہر چڑھتے تھے۔ اماں جی ابھی جیتی تھیں کوٹھری میں لٹکے بڑے دیکھیں تو چلائے نکلیں۔ "ڈوہی تو کہاڑن ہے کراٹ کہاڑن تھیں تھی بھرے ہے۔ اندھیرے میں کپڑے کاٹنے کاٹ لیا تو۔۔۔"

بچپن اور اماں جی کے ساتھ اندھیرا بھی جدا ہو گیا۔ کوٹھری کا دروازہ کھٹا پاد سے ایسا کھو ہوا کہ یہ تک خیال نہ آتا کہ مگر میں کمرہوں والوں کی چھتوں اور آگھن کے سوا ایک کوٹھری بھی ہے۔ برسوں سے بند پڑی تھی۔ کبھی کبھار کھٹا موسم بدلنے پر جب جاتے موسم کا ٹھنڈ ہوا اور رکھا جاتا آتے موسم کا سامان باہر نکالا جاتا یا کبھی کوئی ٹھنڈی کوئی انفریگر چار یا اندر لانے کے لیے کوئی پینڈا نکالا تو کوئی جڑ بکھل جاتی مرمت کی نیت سے نکالنے کے لیے۔ اب کی گرماں آنے پہ کوٹھری بھر کھل گئی اور اس کے ساتھ کوٹھری سے رشواں کا بھر بدل گیا۔ لاف گدے کا ٹھنڈ پر گتھو کر بچے اترتے سامنے والی کھوئی پر کاٹا چھٹا نکال دیکھ کر اسے اپنے چھیننے کا خیال آیا کہ مٹا بیٹک ہو گیا تھا اور سوچنے لگی کہ چھٹا اس سے تو اچھا ہو گا اسے اتار لے چلو کہ سامنے میں بچے نظر کی جہاں گرمی زمین پہ جیسے جانے کن برسوں سے بھڑاؤ نہیں گئی تھی ایک موٹی لکیر کونے میں رکھے ہوئے برسوں والے ریت میں اگلے پڑے صندوق کے پاس چل کر لہرائی ہوئی سی دروازے کے قریب کے کونے میں رکھی ہوئی تھانے کی پٹلی سے تھلی دیک کے بچے گم ہوئی کھائی دی کچھ اٹھنے سے کچھ دُور سے اسے غور سے اس نے دیکھا۔ فلک پڑانی میں آئی کہ پانی کو دکھائے عمر اور وہ ان کے کھیلنے کو دیکھ کر اپنا فلک اسے غور سے دیکھا اور زمان کیا کہ وہ ان کا نشان ہے۔

والان اور کمرہوں میں بھڑاؤ دیتے دیتے کوٹھری کے آس پاس پہنچتی تو کوٹھری کے کپے فرش کا اسے خیال آ جاتا جہاں فحشوں

مخوں میں تھی کہ نیچے جاتی تو چار ہاتھوں پا بھر آتا اور جھانڈو کا دھنکے گھر ریت آتی اور وہاں انسان کہ برتنوں کے بڑے صندوق کے نیچے سے نکل کر تانبے کی جلی بے عقلی ایک دیک بک گیا تھا۔ اس کے سامنے تصویر سی سی آتی وہ اسے دلچ کر دیتی۔ مگر توڑی در بدر اس کے ارادے میں ضعیف آجاتا اور اندھیری مٹی میں مل کھاتا انسان پھر تصور میں ابھرتا اور ماضی کے اندھیرے میں گہر لیتا اور تنک ریگن چلا جاتا۔

"اب جوتا مسٹ لے" انہاں سی نے نوکا۔ "اس کے کان بڑے بڑے ہوویں لہا اور اپنا نام تو بڑی جلدی سے سنے ہے۔ ایک دلو کا ہوا کہ میں جو بچکے پھر اچھی جوتی پاؤں میں ڈالی۔ سامنے آگھن میں کہ یاد نکھوں کہ مواد آدھ صوا پڑا ہے میں نے حیرے مہاں کو آواز دی۔ مجھ کا مل کھاتی نے جہاں کا نام لیا تو وہ سرسرا اٹھا یہ جاوہ جا۔"

آپائی کرم۔ غوزی مجھے پرکھی ہوئی نظریں انہاں سی کے چہرے پر انہاں سی پھر شروع "مگر ہے بہت پرانا۔ مجھ تو جب سے اس گھر میں آئے۔ اس کا کہنا۔ اللہ بخشے ہماری ساس کی ایسی عادت تھی کہ جدوں کسی چیز کالے کی ضرورت ہوئی چراغ حق بغیر کھڑی میں گھر گئیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ آہستہ آہستہ سر سر کرتا صندوق کے نیچے۔ بے چاریوں کو کم دیکھتا تھا انکل سے ملتی پھرتی جس ایک دفعہ تو بال ہال میں اندر جو گئیں تو بڑ بڑانے لگیں کہ اسے چیلانا زمین پر کس نے پیچک دیا ہے ہاتھ جوڑا اٹھیں تو اسے مہا دھوری...."

آپائی کرم مستحان بھیجی جس۔ پھر پھر ری لے کے بولیں "بچی بات ہے میں تو کبھی شک بھی نہیں پڑا تھا۔ آپ کے بیٹے کے ساتھ ایک دفعہ ہوئی۔ وہ پوری کا وقت میں سے سوچا کہ آج سبھی کمال کے کھول ڈالوں۔ تو ذہن بہت مٹی میں اس گئی ہے۔ بچکے بچکے حیرا بے بیٹے آگئے۔ میں تو سبھی کمال کے ریتی تھی وہ بڑ بڑانے لگے کہ چھڑی کس نے زمین چٹکی ہے۔ نیکی تال سے اس مشکل سے نکالی ہے ٹوٹ کئی توں گئی۔ وہ ہاتھ ڈالنے کو کہتا ہے میں اس جی وہ تو ہر کما کے سناک سے غائب۔"

انہاں سی نے تاکید کی۔ "ایسے ہی غائب ہووے ہے۔ ابھی دکانی دیا ابھی غائب بس خدا ہر بلا سے بچا ساجی رکھے۔"

آپائی سوچ میں بہت کئی جس پھر ری لے کے واپس آگئیں۔ "ہاں خدا ہر بلا سے بچائے اور اس موزی کے دم سے تو میری جان جاوے ہے۔"

"مگر بی بی اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔" انہاں جی بولیں۔ "جنہیں فیض پہنچتا ہووے ہے" جس نے کچھ جاوے ہے۔ اللہ بخشے ہماری ساس ایک کہانی سنا چکے تھیں کہ ایک شہزادے سے سرسرا لوں نے سنا کیا اور شہزادی کی بھانجے ایک دھمی غرضی لوطی کو ڈالے میں بخدا دیا۔ منہ میں ذرا نہ چیت میں آنت پھڑکی پھر "چوڑا اچھا۔ عروسی کی رات مسبری پر چٹھی لال جڑ سے میں

بھٹی قرقر کا بنے شہزادہ آوے گا اور کھٹکٹ اٹھاوے گا تو قیامت چا دے گا۔ اسنے میں کیا دیکھے ہے کہ کڑیوں سے کالی رسی لگی ہے۔ دم اوپر سر پہنچتا کھلا ہوا۔ کچک کچک اور کچک کچک اور اس کا منہ اس کے چنڈے ہے۔ اس کم بھٹی ماری کی بری حالت کا تو وہ جان میں لہوئیں۔ تو بی بی کیا ہوا کہ اس نے ایک بال منہ میں لیا اور چھوڑ دیا۔ وہ کال پڑ گیا۔ اور یہ لہا کو لہے سے بچے پچھے۔ ایک بال منہ میں لیا دوسرا بال منہ میں لیا تیسرا چوڑا اسے لی بی دیکھتے دیکھتے سارے بال کالے ہو گئے اور یہ لہے کہ چنیا کو لہے سے بچے مل کھاوے۔ شہزادہ جو داخل ہوا تو شہر۔ گھما کر عروسی کے کمرے میں مسبری کھجی ماہری کا کھولا اتر ہے۔ لیکن ہے کہ پری۔ چندے آگے پچھلے ہاتھ پیراں منہ میں لائی تو لی گھنٹی لہوئی کھجی ماہری کھجی لہوئی۔ وہ دل دھان سے فریخت ہو گیا۔"

آپائی انہاں سی کا منہ کھٹکے لگیں خود وہ حیران تھی کہ لوطی کی شہزادی کیسے بن گئی۔

"انہاں جی وہ شہزادی کیسے بن گئی؟" وہ پچھنے لگی۔

"بھٹی جب گھر پر لہا کھاوے ہے تو جہاں جی بدل جاوے ہے۔"

"مگر انہاں جی ایسی بھی کیا جان دہتی ہوئی۔" آپائی جواب سے بولیں۔

انہاں جی توجی پر چل پڑ گئے۔ "اری مجھے کیا بھوت ہوں کے اپنی عاقبت بگاڑتی رہی ہے۔ خدا تو اب کہنے والے پر ہم نے تو یوں سی تھی۔ بی بی بات ہے کہ کہنا اپنا نصیب ہے نہیں تو وہ آدمی کو کسی گل پہنچنے ہی نہیں دیتا۔ کھولا زہری جان کا کبیری۔ اور خود ایا اچھٹ کت نہاری ستاوے نہ سوٹ آوے۔"

"سے انہاں جی کیا کہہ رہی ہو؟" آپائی نے بہت ضد کیا۔ مگر پھر منہ سے حیرت کا کلمہ نکل گیا۔

"اسے تو پھر عروسی شک آدمی کی تو عادت ہے کہ ہزاروں سال میں جا کے کہیں بوڑھا ہووے ہے۔ سو کچھلی اتاری اور پھر دیکھا ہی جو ان۔ اپنی موت تو وہ مرنا نہیں ہے کوئی سر نکالے۔ تو وہاں بات ہے۔"

"انہاں جی" وہ سوچتے ہوئے ہوئی۔ "وہ مرنا کیوں نہیں ہے؟"

"بھٹی اس نے بولی کھالی ہے۔" انہاں جی مائل پڑیں۔

"اب سے دور باں میں ایک بادشاہ تھا۔ اب اسے بھی بھوت ہزاروں کا تھا کہ دہریا کا بہادر۔ دونوں نے مل کر کچھ کے عجب ڈنگے بھانے۔ ہوا کیا کہ دہریہ چار ہو کر مر گیا۔ بادشاہ کی کفر تو گئی۔ مگر وہ موت ہارنے والا کہاں تھا۔ جڑا لٹا کھیا کہ موت پہنچ پاؤں گا۔ ہر من کچھ پانچ پانچ۔ دن سڑاٹ سڑاٹ نہ کھانے پینے کی سدا۔ ساتھ سندھ پاراک سندھ پر پہنچا کہ ایک

پہچے ہوئے فقیر نے اس کا بچہ دیا تھا اور غور لگا کہ اس کی کئی سے بیوی لپا جیسے کھالیتا تو موت کے بھینٹ ہی سے بچتا رہا۔
 دو پہی کی قسمت کا وہاں ہونے لگا تو رستے میں ندی پر دی۔ مٹیوں کے سطرے تھکا تھکا دو بوسہ راتھا میں آئی کہ نہاںوں پنڈا اٹھنا
 کروں۔ کپڑے اتار فرما پ سے ندی میں۔ اسے لی بی بی اس نے ڈی لگی تھی اور ادھر ایک کیزا بیوی کو سند میں با یہ جاو جا۔ بادشاہ ندی
 سے نکال نکل پیچھے بھاگا۔ سارا جنگل چلاٹ کر دیا۔ ایک ایک درخت کو چھتا۔ ایک ایک کھوکھوٹا۔ مگر بی بی وہ تو آن کی آن میں چھو
 گیا۔

دم کے دم میں ظاہر ہوا اور نائب ہو جانا بجلی آنکھوں کے آگے گوندی اور اندھیرا چڑھ گیا وہ چھتا وہاں اس کے لئے حیرت کا
 مستقل سامان تھا۔ اسے جو یاد آ جاتا جو روز کی صبح کیا شام کھڑی وہ پیروں میں اور چاندنی راتوں میں اس کے ساتھ کھیتا رہتا اور گھومتا
 پھر جاتا اور پھر ایسا گم ہوتا کہ کب تک نظر نہ آتا۔ وہ وہ پیریاں اور وہ چاندنی راتیں اس کے لئے اب خواب ہیں پھر سہاں کھیتے کھیتے کوٹھری
 میں اس کا چھتا۔ کوئے میں دھکی ہوئی مٹی سے قلعے دیکر برحق کا بڑا صندوق ہے لہذا کی نگلی سمیڑی برابر میں اس کی کوٹھری چار پانی جس
 کے بالک میں سے تو بالکل نئی غائب ہو گئے تھے۔ اندھیرے میں دھیرے دھیرے ساری چیزیں دکھائی دیتے تھیں نہ دکھائی دیتا
 تو جو۔ پانڈا کہاں چھو ہوا کیا کس کھوکھو میں جا چھپا۔ زمین میں سا گیا کہ آسمان نے کھالیا اور اسے بین برحق والے صندوق کے پیچھے
 سے کانا کلاسز ڈالسا اور وہ ایک رکھت سے بکارت لیتی "ہاؤز بکرا کیا۔" کبھی آگہ بکھلی میں دونوں آنکھیں کوٹھری میں جا چھپتے۔
 اندھیرے کوئے میں کھڑے کھڑے دیر ہو جاتی اور اندھیرا پھل پھل شروع کر دیتا۔ اندھیرا آسمانوں میں اترنے لگتا اندھیرا جھوسے
 لگتے لگتا اور اندھیرا باہر میں ایک رشتہ پیدا ہو جاتا۔ گنا گنا ڈالوں اور چاندنی کی دنیا بہت پیچھے رہ جاتی ہے۔ اندھیرے کا جہاں شروع
 ہے۔ کالے کوسوں کا ستر بے نشان دے منزل پر دلان میں آہٹ ہونے پانڈا میرے کا جہاں بکارت لگتے۔ چوڑھونڈا ڈھونڈنا نہیں
 ڈھونڈنا کبھی جب وہ اندھا بھینسا ہوتا تو کوٹھری میں اس اطمینان سے داخل ہوتا جیسے اسے سب کچھ دیکھتا ہے اور وہ دیکھ کے پاس آ
 رکھت ہے اس پ پانڈا ڈال دیتا اور اس زور سے چٹا پیچھا کہ اس کی قہقہے نکل جاتی۔

چٹا میں چٹا ڈال دیتا پانڈا بھنے لگتی تھی آگے بال اسے لیے تھے کہ جنہاں گتے۔ کالے قہقہے لیے لیے بال چٹا مونہ سونکا پھیلتی اور
 گوری گردن سے نیچے کر پے گنگن سی لہرائی۔ کلوں سے بچنے لگتی اور جب ہانے سے پہلے چو کی منہ کے پے ہوئے کیسے
 رخصتوں سے دھوئے تو بال کوٹھری کوٹھری لگتی زمین کو چھو جس۔ سر کے بال اس کے سر سام میں گئے۔ مرض اندھی دھانسی آ پ
 اور تین دن تک یہ عالم کرتا پے کا ہوش نہ پھر کر کہاں ہے۔ ان تین دنوں کا خیال اب آتا تو لگتا کہ اندھیرے میں ستر کر رہی ہے۔ اس

ستر میں دو کئی دور نکل گئی تھی۔ کالی اندھیری سرحد تک جہاں آگے اندھیرے سے اندھیرا چھوتا تھا اور اندھیرے کی کالی راہ جہاں
 شروع تھی۔ سرحد کو چھو جتے چھوئے دو بجلی اور پھر آواز اور چاندنی کی دنیا میں واپس آ گئی۔ اس لیے کالے کوسوں والے دہشت
 ہرے سترے کا اثر آثار جسم پر ظاہر تھے چمک کیا تھا اور بالوں پر کہ چھوڑے اور چھوئے ہو گئے تھے اور چٹا پنا ان کا دم پر کیا
 قلاب چٹا چٹا کے دھلے سے کلوں تک پہنچتی تھی۔

دلان سے گزرتے گزرتے ان کے قدم کوٹھری کی طرف اٹھے اور پلٹ پڑتے سوچتی کہ چٹا چٹا چٹ جانے کن برسوں کا کوٹھری
 پرانگہ ہے اس قافل کب ہے چٹا میں ڈالا جائے اور اسے کوٹھری سے اتار۔ کی نیت تو ڈی مگر پھر بے چارہ میں کوٹھری دیکر کھٹکے
 کا خیال آ جاتا اور اس کے قدم اس طرف اٹھے۔ دلچیز پر چٹکے چٹکے پھر کتے اور لے لہراتے ہیں تصور کی نگہ بھٹکتی تھی۔ لمبی ہونے لگتی
 اور چٹکائی جیسے دنوں کے کلوں کھدروں میں جاگتی....

"انہاں ہی تھیں تو اچھا غانا تھا۔ میں نے سوئے وقت ٹائمن کے دیکھا تھا۔ میں جانوں کہ جی گزرتی۔"

"تو جہتی اتنی کم کیوں تھی۔" "اماں ہی ہوئیں۔" "دن خراب ہیں۔" "جانیں کیا موقع ٹائمن لگائیں لگلی نہیں کرنی چاہیے۔" "مجھ دیکھا
 کی کھوکھو کھوکھو اے کہ کیا کروں۔" اندھیرا گھپ ہاتھ کو ہاتھ بھٹائی نہ دے۔ سر سر سوچوں کہ کیا چیز ہے۔ کھ پڑا کر رہی۔ پھر
 سوچوں کہ شاید میرا دوسرا دوسرا ہے جسے میں سر میں چٹکے لگیں۔ ڈار بے کی طرف جو نکھو تو ہو جتے جھین نہ آوے گا پے کیا
 ... میرا تو دم نکل گیا۔ مٹی سے آواز نہ لگے۔ پھر میں نے ہمت کر کے کہنے لگا۔ "ہو ہوا ہو۔"

"انہاں ہی تھیں تو ڈال دیتا ہوں نہیں کہ آپ نے کب آواز دی تھی۔"

"بی بی تیری نیند تو بیوٹی کی ہے۔ مگر میں قیامت آ جاوے۔ تیرے کان پر پتھر سے بھیں رہتے پتھر پتھر۔ مرا سارا ہزار مگر
 ایسی نیند بھی گئی تو پھر میں نے منھیں کو پکارا۔ اور ہی منھیں اونھیں مگر اس سخت ماری کو بھی ساپ منگوا گیا تھا۔ اب کیا کروں۔
 بی بی ماری رات پھری بھیجی رہی اور آٹھیں پڑھتی رہی۔ دھڑکا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تو سا جاؤں اور نہانے پینڈا ب کے لئے کوئی
 اٹھے اور صفی کی تو اس بری عادت ہے کہ آدھی سوئی آدھی جاگتی چ پانی سے اترے گی اور نکلے گا بی بی پس ہادی دھڑکا کے میں
 ترکا ہو گیا تو ڈال دیتا ہوں"

"اور صفی کیا کر رہی ہے بی بی۔" "اور بی بی خانے سے آ پانی آواز داتی اور صفی بڑ بڑاتی اور تصور کی نگہ ساگ سے غائب۔ پھر وہ
 کام دھندے میں ایسی صفی کی برتن جان کا ہوش نہ رہتا۔ چھوئے پاس چٹا لے اور برابر میں رکھی تھاتی سے پھر پھر مٹی راکھ ہر برتن

میں ڈائی اور بانوں کے جوئے سے اتار گزرتی کمر کے پانی سے تر پڑے دے کر جب وہ دیکھیں چلیں سلی کی بانوں کو تھیں لے لوگوں کا تھنے کی تھکی کی ہوئی سچی اور بھرت کے تھکے کو ایلے موم کے کاٹھے دان سلور کے بڑے ہارے اور غلے پھسل کرتے مراد آبادی گلاس کو کمر لے دلی چھتری پہ دھوپ میں چلتی تو وہ شیشے سے چٹکنے اور لٹکانا کا ناچھے نہیں گئے ہیں تھکی ہوئی ہے۔ بجلی راکھ میں نظر سے اچھ بھی جس کے تر پڑوں سے کھائی میں بھری بجلی آسانی چڑیوں میں مٹھا مٹھا شور پیدا کرتے ایک نئی جان کی باتے اور گورے ہاروں سے لے کر اعلیٰ کھائی تک اور اعلیٰ کھائی سے کھلی تک اچالے کی ایک کرن دوڑے نکلتی۔ لیکن تھوڑی سی دیر میں وہ اعلیٰ اعلیٰ اور اعلیٰ اعلیٰ بیٹے آئے میں میں جاتیں اور لکڑیاں انگوں سے کوڑا اچھے لگتا اور لگتا آکا کھانیاں چھوڑ آگے کی ایک دو چڑیوں تک کو سان لیتا مٹھیا آکا کمال کو چار گوندھی تھی کہ کو چوہی مارے تو چپک کر رہ جائے۔ پھر تو سے پ بڑی بڑی دوتھی روٹیاں ڈالتا؟ مگی میں بیٹھتا اور لکڑیاں مگی کی تھی بھاڑتا۔ مگی مگی جب شام کے اندھیرے میں تو چوہے سے اتارا لانا کرتی تو سرخ نمے ان کت تارے تو سے کی کا لوں میں حیرت بھڑکے لیے نظر آتے۔

”آپنی تو افسر رہا ہے۔“

”تو سے کا بھٹا اچھا نہیں ہوتا۔“ آپنی ہنکھرانہ لہجہ میں جواب دیتیں۔ ”اس پر اچھا ڈال دے۔“

کام کا دن کی اس مصرعہ میں تات بھی زبان جسم سے الگ بھٹکنا رہتا۔ مگی دلال میں بھاڑ دیتے دیتے مگی چار پانی کی ادوان کہتے کہتے مگی رستم کی نیل بجلی لپٹیاں کھلے سلھاتے اس کے جسم کی نقل و حرکت سے الگ تصور کی گئی تھکی تھکی اور دھرا لکیر سے بھرے سر سے بیٹے دونوں کے اندھیرے میں دیکھتے تھکی دلال کی یاد آتیں دلال کی کی باتیں اور کھانیاں انتہی سادہ سی بات پان کا چونک اٹھتا اور چونک اٹھتا دالی بانوں پر سادگی سے بات کرنا اور گز رہا نا کو طوری کے کوئے میں رکھی ہوئی دیکھ کو صاف کرتے کرتے جب دلال کی سے ہاتھ میں نیچلی آگئی تھی تو کس سادگی سے انہوں نے اٹھایا دیے کہتے ہوئے الگ اصحاب سے رکھ دیا کہ ”بھیرن کی لوطہ یا کوئی کھائی ہے۔“ اسے بھگوا دیے۔ ”اوہ ایک صبح کو جب کابک کے خانے سے سلیہ کی بڑی کڑی کی طرح سوچی مرزا علی تھی تو دلال کی کوئی یاد آ کر رات انہوں نے کابک کے برابر چھٹا رکھی تھی۔ دلال کی پی پائے کتار لکڑیاں آکا تھا کہ غائب چڑی ان کے لئے حاضر تھیں اور ایک دو تھی کہ کتار تات اور آکا دیکھنے سے قدم قدم پر دیکھتی چلی آ رہی تھی۔ لیکن اصلی چڑ بیٹھ گاہوں سے اچھل رہی۔ پر چھائیں ہر موز پر دست کا قاتی لیکن پر چھائیں دلال کا لکھا ہے۔ مگی مگی کتار کو کچھ کر لٹکانا کر گزرنے والا ابھی کر رہا ہے اور وہ قدم مار رہی تو اسے جا بکریں۔ اس عجیب سے اس کا دل دھڑکنے لگا اور جھرمجری آجاتی اور پاؤں سوسوسا کرنے لگے۔ جین پڑے یہ

جب ایک دن صبح وہ اور رونا جو بھلیاں پکڑے کمر سے لٹکے تھے تو کالے آموں والے باغ کے کنارے کھلی زمین پر پانی میں تر پڑ گیا مگر گرد پڑا تھا۔ پس پاؤں ہاسا اس کا کھجک جا بھانگل اڑ جانے سے سلیہ سی چڑی نکل ہوئی جیسے ابھی کسی نے کھڑا سی چلائی ہے۔ دونوں حیرت سے کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

”رات بجلی گری تھی۔“

”بجلی؟“

”بچے نہیں سے رات جیندہ رہتے رہتے کتھی زور سے بجلی تڑتی تھی۔“ جو کہنے لگا۔ ”ایسا لگا کہ کھاری صحت پر گری ہے۔۔۔۔۔“ وہ بڑبڑانے لگا۔ ”اس کی کھصل میں کلا سا پڑ رہتا تھا۔

بہت پرانا تھا۔ رات بھلا دھکا۔ بجلی کالی چڑ پر گے۔“

”کہاں گیا وہ پھر؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”کہاں گیا۔“ وہ اس کی بے وقوفی پر ہنس دیا۔ ”بجلی نے اس کے کھل اڑا دیے۔“

سوچتے سوچتے اس میں یہ خواہش شدت سے جاگتی کہ وہ زمانہ پھر پلٹ آئے اور لندن کے کوڑ پائے گوند سے کھلی میں کوئی پکڑ لے اور اساتوہ چار کا وہم ہوتا جہاں جاتے جاتے پھر پلٹ پڑے۔ دلال کی سے اسی طرح کھانیاں کھاتیں اور تھکتیں سی جا میں اور سنی اس کی کر کے بارش ہونے پر اندھیرے سے ہاتھ مدھوئے کھٹے چڑ پانی میں چھپ چھپ کر تھیر بھلیاں پکڑنے کھلی جا میں تھیر بھلیاں کھلی تھیں تو پتے اور پتے نہیں تو ساپ کی پھڑیاں دلالان کے ہاتھ پہ بھکا ہوا دھکڑی کا تھمہا اڑتا پرتا ہو گیا تھا کہ کڑی کھل کھار کھانگل کالی پر کئی تھی اور برسات میں تو اس کا رنگ اور مگی کالا پڑ جاتا تھا۔ دو چار بارشیں ہوئیں اور اس کی جڑوں اور دروازوں اور دروازوں میں سلیہ کی پھوٹی شروع ہوئی۔ ہمار دیکھتے دیکھتے سلیہ کالی سی پھڑیاں تن جاتیں چوہا سے ٹوپ بن جاتے اور کسی کسی پھڑی پر کپکپ کہیں کالی تھی اس کی دھار پائیں توڑا مگی اک حیرت طعنے کے اوپر اکی ہوئی ساپ کی پھڑیاں تو اس کی اور جو کی دونوں کی دھڑس میں تھیں۔ لیکن وہ بڑے بڑے دیکھ نوپ جو چھپے کے پیچھے دیوار کے برابر پھولے تھے ان تک اس کا تو کیا جو کا مگی مگی ہاتھ نہ نکلی نہ نکالنا ایک دھڑ دھڑاٹے کے سہارے بھر طاق پڑی رہا کہ اٹھا اچھا کھلی گیا تھا کہ طعنے کی کڑی کو چا چھو تھا۔ ساپ کی پھڑی پھر مگی اس سے پڑے رہی۔ لیکن کوئی بات اس کی کھلی سے نکلتی ہی پر سے کیوں نہ ہو ایک مرتبہ وہ سر ہڑو ہاتھ دھکا تھا۔ کالے آموں والے باغ کو جاتے ہوئے جھکا لکی کو کیا پڑتی تھی اور جس پہ بھلا ہوا بڑ کا رعت اٹھا کھٹا تھا جب تک بہت جھک کر

لگا کر نہ دیکھتی، بالکل جھینڈا تاکر اس میں پانی بھی ہے اس پر پٹائی کر جو بڑا چڑھتا اور میں کو نکالے اور پھیلے ہوئے گھر سے پرستش کر اعلان کرتا کہ وہ "گودا ہوں" اور اس کے جھونکے کی زمین لٹل جاتی اور کرکڑا کے کہتی۔ "جس جوتیں" جو کہ تھروں سے لگتا کہ اس کی گڑگڑاہٹ کی اسے ذرا برابر پر وہ نہیں اور اس نے اب چھلانگ لگائی مگر پھر آپ ہی آپ وہ اور ادھر ترک کر دیتا اور گدوں سے پھسلتا پھلتا جھٹکتا مٹنے پڑ جاتا۔ اور نیچے اتر پڑتا۔ مگر آج اس نے چھلانگ لگائی تھی یا کر پڑا تھا یا کیا ہوا تھا اسے تو پتہ نہیں۔ اس دروازہ دیکھا یا کیا تھا اس نے تو بس اک شرمناک جھراٹی سہ جھاگ بھاگ آیا اور جو کہ گھر کے کواڑ پہنچ ڈالے۔ جو کہ ابا گھبرائے ہوئے نکلے اور جس حال میں تھے اسی حال میں تھروں و پریشان سٹ پٹ کرتے کافی کر یا کو ہولے۔ ان کے پیچھے پیچھے محلے کے اردو لوگ۔ جو کہیں گئے تھے۔ وہ جاننا تو لیاں بتائے سٹشہر کو کھڑے تھے۔

"کون؟ جو؟"

"مگر پڑا کافی کو نکالیں؟ کیسے؟"

"اللہ جانے۔"

"ارے صاحب وہ لوٹو تو زلومٹی ہے وحشی۔"

آپائی کہہ رہی تھیں۔ "اسی لوٹا تھا بھی نڈریاں آتا تھا سوکھی جھپے پٹک رہے کبھی کوٹے والی منڈیر پہ۔ میرا دل کاپ کاپ کا پ جادو تھا۔ بڑا راز دہن دہنے والا بھی کہ بھیا مگر جا کے باں کو پینٹ کا قاشا دیکھا اور صلیب کو بھی مارا کہ اس کے ساتھ تو کیوں پاؤں بیٹے ہے۔ مگر ہاں اس پتو جن سوار تھا ایک نہیں ملتا تھا کسی کی۔"

اماں بی بولیں "ارے فریب کا ایک ہی بچہ ہے۔ اللہ رحم کرے۔"

"پاں اللہ رحم کرے" انہی پھر آپائی کا لہجہ بدلا۔ "اللہ اسے چادے مگر ہم اب صاف کہہ دیں گے کہ باا جھنڈا سہارا ہے یا جانے۔ تارہی یعنی اسے نہیں جانے کی۔ اسی ایسے لوٹے سے کیا اعتبار کرنا کبھی کھڑا ہے۔"

وہی یہ تو بھدکی بات ہے۔ "اماں بی نے پھر صہرا سانس لیا۔" اللہ رحم کرے فریب پہ۔ یہ کافی کو نکال پڑی کم بات ہے۔ ہر برس بھیشت لہو ہے۔"

شام پڑے لوگ اسے چار پائی پے ڈال کے لائے۔ کپڑے پانی میں شرمندہ زبال چپکے ہوئے چھو بیٹا جلدی جسم نڈر حال بیوٹی طاری۔ تھوڑی دیر کے لئے لگی میں سنا جھانک گیا۔ سنا تاجس نے سالوں بعد اس لگی میں ایک بار پھر دیکھا تھا اور جو ہی کے حوالے سے۔

جب جو کا کار یا تھا جو کہ جانے کیا ہی میں سہائی کر گھر میں لے کے سنے فوج میں بھرتی ہوا تھا پتہ نہ کیا تھا۔ سال ڈیڑھ سال اس کا کوئی اتنا ہی نہیں ظاہر جب اتنا چٹا ٹوٹا سٹائی کے ساتھ۔

"اوری کیا جھکا کار یا ہے۔"

"جو کا کار؟"

"اللہ رحم کرے۔"

آپائی نے رو نہ لیا پتہ تو حالات دیا چو لہی کی آگ بھڑائی۔

گلی میں تھوڑی دیر بالکل سا کار یا۔ آنکھوں آنکھوں میں بات کرتی ہوئی ششدر ٹوٹا لیاں۔ جو کہ ابا کے اٹھتا ہر پڑھتے پڑھتے کا پتہ نہ لے کر ابلے کھا کھا کھا اسی طرح تار لے کر جھکا کے پٹے کا پتہ اندر چلے گئے۔

وہ بھرتی بھرتی لے کر ہوش میں آ گئی۔ کوارے میں بیٹھ کر دھوپ میں چڑی رکھے رکھے بہت دیر ہوئی پھول گئے تھے۔ جلدی جلدی چپٹا کھوئی کہ پینٹ کئی تھی اور ابلے ہوئے بال بد رنگ ہو گئے تھے۔ بیٹھے رستھوں کا کوارا لے کر جب وہ غسل خانے میں پہنچی اور کھلے ہوئے بالوں میں سے اتنا تو پیلے پیلے سفید بھاگوں سے بال کچھ اور بد رنگ ہو گئے۔

غسل خانے سے تھوڑا کر واپس ہوتے ہوئے وہ کھڑی بھر لے اٹھتی دھوپ میں چڑی کے پاس رکی۔ بالوں کو دو دھین جھٹکے دے اندر کمرے میں تھی اور آتے پینے کے سامنے کھڑی ہو گئی اصل دھلا کر ان میں بجلی سی ٹاٹا والی اور نرمی ضرور پیدا ہوئی تھی مگر وہ کیفیت کہاں کہ کھینچے تو کھینچ کر آتی اور جڑا ہوا ہڈی دوسرے پیچھے ایک سیاہ چٹکا پلٹت مقل نظر آتا۔ اماں بی تھن تھن کر بھرتک بالوں کر کر پڑیں اور جو میں اور بھٹیں اور بھٹیں بھٹیں بھٹیں کھینچی کر تھیں سلیمنا تھیں پٹیاں باندھیں اور جھڑے ہوئے بالوں کا لٹھا کا لٹھا لپٹ کر اس پہ تھوڑا کر تھیں اور لنگریاں انٹھوں والی دھار کی کسی دروازہ میں اڑیں دھتیں اور اب دھکے چھوڑے مرے مرے سے بال نہ جو میں نہ دھتیں نہ بھٹیں نہ اماں بی کی کھینچی نہ ان کی مٹائی الگ پاس کا ایک ایک کر رستم کے لمبے کی طرح سلیمنا تھیں اور ستور تھیں۔ بالوں سے بہت کر اس کی لٹھا چڑے پگئی جس کی دھک خوشبو بن کر ادنی جاری تھی بلکہ چارے بن میں جڑا کے ایک آٹلی تھی مندی ہو چلی تھی۔ اسے خالہ جان کی دھکسر پھسرا دانی جب وہ پچھلے دنوں آئی تھیں اور آپائی کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھی تھیں۔

"آپائی اسے کب تک کوٹے سے لگائے تھیں رہو گی۔ مراد زریادہ ہو گئی تو لوٹا یا قاتل جادو ہے۔"

"بہنو مجھے کوئی فرق ہے کہ جوں لوٹا یا کھر میں سٹو اسے رہوں اور اب مہراس کی پیلنے کی نہیں ہے مگر کروں کیا؟"

سیڑھیاں

بشیر بھائی راجہ دھوت بالکل چپ بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ آخر کو بکلی بکھڑکی ہوئے گل۔ انہوں نے آہستہ سے ایک لمبڑا سانس لیا اور ذرا حرکت کی تو آخر کی جان میں جان آئی مگر ساتھ میں ہی یہ بھڑکا کر نہ جانے ان کی زبان سے کیا نکلے۔

”وقت کیا تھا؟“

”وقت؟“ آخر سوچ میں پڑ گیا ”وقت کا تو دھیان نہیں ہے۔“

”وقت کا دھیان رکھنا چاہیے۔“ بشیر بھائی اسی سوچ بھرے لہجہ میں بولے ”اس کے بغیر تو بات ہی پوری نہیں ہوتی۔ اول شب ہے تو اس کی گھڑکی بات نہیں شیطان دوسرے آتے ہیں جن کی بنیاد نہیں۔ آخر شب ہے تو صدقہ دے دینا چاہیے۔“

آخر کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ ریشی اسی طرح خاموش تھا جس انگٹھوں میں تھیرکی کیفیت زیادہ گہری ہو گئی تھی۔

”میری عادت ہے کہ وقت ضرور دیکھ لیتا ہوں۔“ بشیر بھائی کی آواز اب ڈراہاک چلی گئی۔ ”اور بھرا پنا تو کچھ ایسا قصہ ہے کہ کچھ ہوتا ہوتا ہے تو ضرور پہلے دیکھ جاتا ہے اور ہمیشہ کے میں آگے ہٹ سے کھل جاتی ہے۔ لگتا ہے کہ ابھی جاگتے ہیں مگر دیکھتا تھا.... یہاں جب میں آ جاؤں تو کئی سینے سرگرداں بھرتا رہا بڑا پریشان۔ بہتری کی کوئی صورت نہ نکلے۔ خیر ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ ناامروم ہیں سمجھ سے نکلے ہیں ساتھ میں بڑا دل کا دوتا ہے ہزار ہوں کا دوتا ہے وہ نے میں سے ایک بڑا دل ہے اور مجھے دوسے رہے ہیں.... ہٹ سے آگے کھل گئی.... صبح کی اذان ہو رہی تھی اٹھا ڈھونڈا لٹاڑ کو کھڑا ہو گیا.... یہ کچھ لوگ تیرے دن تو کرمی مل گئی۔“

ریشی اور آخر بڑے اٹھا کہ سن رہے تھے۔ سید اسی طرح ان کی چار پانچوں کی طرف روٹ گئے آٹھس بند گئے لیتا تھا اور سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

”بشیر بھائی! آخر لا“ مجھے تو مرد سے بہت ہی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کیا بات ہے؟“

مرد سے کوئی بکرت کی پٹائی ہے۔ عرصہ زیادہ ہوتی ہے۔“

”آپا جی میں تو جانوں جیسا کیا ابھی ملے وہ بول پڑھا کے ہاتھ میں پکڑا دو۔“

اس نے پھر ایک جھری جھری لی ذرا سرگرمی سے بالوں میں کھسکا کر شروع کر دیا۔ اٹھیں سے بالوں کی ٹیس ستوار سے اس نے محسوس کیا کہ تیل گتے پر بھی پال اس کے کچھ روکے روکے ہیں۔ روکے بال کے چھوڑے بھی ہیں اور پچھلے بھی۔ ان کی وہ چمک اب سختی مدھم پڑ گئی تھی۔

چٹا باندھتے جب اس نے چٹاٹا اٹھا تو وہ بالوں سے بھی زیادہ روکھا اور روکے سے زیادہ پکتا اور میلا نظر آیا۔ چٹاٹا وہیں رکھ چٹاٹا وہ بندھی پھوڑو کرے سے لگلی دالان میں آئی۔ دالان سے مڑی کھڑکی کی طرف چلی۔ کوئی کوئی جانو غلاب میں چل رہی ہے یا کسی نے جاوہ میں باندھا ہے۔ دلچیز پدم رکھ کے کھنڈی کوئی۔ کواڑوں کو ہلکا سا جھکاوے کر دھکا دیا۔ داخل ہوتے دھچ دھڑا چوکی احساس ہوا کہ اندھیرے کی حد شروع ہے اس لہجہ کا کثیر کا خیال آیا جو بڑے صندوق کے پاس سے چلے کھائی ہوئی دیک کے برابر تک پہنچی تھی۔ اس کا دل آہستہ آہستہ دھڑکنے لگا۔ وہ اندر اندھیرے میں قدم بڑھا رہی تھی کہ نیچے اتر چکی تھی زمین میں ساری تھی۔ نیچے کی ایک اندھیری آئی اور اس کے شعور پر چھانے لگی۔ ایک سرشاری کا عالم ایک ایک ہمہ سارہ کر کوئی بہت بڑا مرحلہ چلنے آئے والا ہے بھڑکا کر جانے کیا ہو جائے۔ اس نے چلتے چلتے اپنے قدموں کے نیچے کے نیچے نرم نرم مٹی محسوس کی۔ مٹی جس پہ بھی وہ نکلے ہی چلا کرتی تھی اور اس کے پاؤں کے نشان ایک ایک خط کے ساتھ اس پہ پھرا آ کر تے تھے۔ اس نے قدموں کے قریب مٹی کو دیکھا۔ مٹی سے اسے فرش لگا۔ وہ لہجہ لکیر کھائی تھی؟ مسکتی یا کبھی ظاہری نہیں تھی؟ کوئی کی طرف ہاتھ بڑھا یا چٹاٹا اٹھا راگرو میں اٹا ہوا میلا چمکت چٹاٹا اس نے اسے پھر کوئی پتا نہ لگا۔

کھڑکی سے جب وہ باہر نکل رہی تھی تو داغ میں ہی ہوئی وہ نشا درخشیدار چمکی تھی اور اس کے روکے پچھلے بالوں میں بے رنگی اس پر غبار بن کر چھائی جا رہی تھی۔



"مگر..... یہ.....؟" اختر جھک گیا۔

"ہاں اس کی صورت ذرا عکاف ہو گئی۔" بشیر بھائی اپنے لہجے سے یہ بات کر رہے تھے کہ کوئی زیادہ فکر کی بات نہیں ہے۔
 "مرے کو ساتھ کھاتے دیکھنا کچھ اچھا نہیں..... کال کی انتہی ہے۔" بشیر بھائی چپ ہوتے ہوتے پھر بولے اور اب کے قدرے
 بندہ آواز میں "مگر جس تو وقت کاچ نہیں۔" سہتے خواب پر انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ احتیاطاً صدقہ دے دو۔"
 سید نے جھنجھٹا ہٹ سے کروٹ لی اور ادھ کے بیٹھ گیا۔ "یاد رکھا لوگ ہمارے خزانے میں جانوں سہاٹی نہیں۔ آدھی رات تک
 خواب بیان کرتا ہے آدھی رات کے بعد خواب دیکھنے شروع کرتا ہے۔ کیوں بھی اختر جیسے سونے کو مگرزی دل چاہتی ہے؟"

اختر کرائے ہوئے لہجے میں بولا "جب آدمی بوہرات کو مذاق میں لیتے ہو۔"

"جب آدمی تو تم بوہر خواب دیکھتے ہو۔ آخر میں بھی تو ہوں لیکن مجھے تو خواب نہیں دیکھتے۔"

"خواب تو خیر آدمی کی فطرت ہے، ہم سب کی فطرت ہے، بس کم زیادہ کی بات ہے۔"

بشیر بھائی کہنے لگے۔

"مگر میری فطرت کہاں رہ کر ہو گئی تھی تو سرے خواب دیکھتی نہیں۔"

"باہل نہیں دیکھتا؟" اختر نے جرات سے پوچھا۔

"جس روز سے یہاں آیا ہوں اس روز سے کم از کم باہل نہیں دیکھا۔"

"صد ہو گئی۔ سن رہے ہو بشیر بھائی؟"

"صد تو تمہارے ساتھ ہوئی ہے۔" سید کہنے لگا "میں جرات ہوں کہ اس ڈیڑھ باشت کے کٹھے پر تم کیسے خواب دیکھ لیتے ہو۔ کمال
 کو کھانا چارچ پانچوں میں چھت چھپ جاتی ہے۔ رات کو کچھ اٹھتا ہوں تو چپائی سے قدم اتارتے ہوئے لگتا ہے کہ گلی میں گر چوں
 گا..... تمہارے مگر کی چھت تھی کہ..... کہتے کہتے نکلا پھر آہستہ سے بولا "کے کو کہا روگا۔ اب تو شاہ جلی ہوئی ایشیں بھی باقی نہ
 ہوں۔"

سید نے ادھر کر منہ پر ہر گئی ہوئی صراحت سے پائی دیا۔ کہنے لگا "پانی گرم ہے۔ کب کی بھری ہوئی ہے صراحتی؟"

"بھری ہوئی تو تیسرے پہری کی ہے۔" بشیر بھائی بولے "مگر یہاں ہی ہو گئی ہے اب کال کو صراحتی لائیں گے۔"

"لائین کی حق مندی کروں؟" سید پوچھنے لگا۔ "بری لگتی ہے روشنی۔"

کم کردہ اور کونے میں رکھ دو۔ اب تمہاری دیر میں تو چاند بھی لگی آئے گا۔" بشیر بھائی نے جواب دیا۔

سید نے لائین کو کم کر کے کرتے ہلا کے دیکھا "تیل کم ہے رات کو کھل نہ ہو جائے۔" دوسری منٹ میں بڑ بڑا پا اور بھی ہوئی حق کو
 اک ڈرا دلچا کر لائین ایک طرف منڈیر کے نیچے رکھ دی۔ لائین کی بجلی روشنی ایک چھوٹے سے کونے میں سمٹ گئی اور چھت پر اندھیرا
 چھا گیا۔ بہتر یوں روشنی اور اختر کی چار پانچوں پر بھی تھے لیکن اس اندھیرے میں سید کا چاندنی بہتر چمک رہا تھا۔ بشیر بھائی کی
 چار پانچی پر بہتر کے نام بس ایک روشنی تھی جو انہوں سمیت کرکے بطور ہانے رکھ لی تھی اور چھت پر چمکنا ڈکرتے ہوئے ایک بھرا
 لوہا دی مگر چار پانچی پر چمک کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کی تھلی چھتری کو تڑی جس پہنچ رہی تھی بلکہ نیچے بالوں کی سونڈی خوشبو نے ان
 کے سامنے کچھ بھی معطر کر رکھا تھا۔

"بشیر بھائی، روشنی بہت دیر سے کم سم بیٹھا تھا۔ اس نے نکلا کر گلا صاف کیا اور پھر بولا۔

"بشیر بھائی خواب میں بڑا ظلم دیکھیں تو کیا ہے؟"

بشیر بھائی نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "بہت مبارک ہے لیکن خواب بیان کرو۔"

اختر وحشی کی طرف بہت توجہ ہو گیا۔ سید نے آہستہ سے کروٹ بدلی اور دوسری طرف منڈ کر لیا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر کے
 سونے کی کاشل شروع کر دی تھی۔

"وہ دن یاد ہے، بشیر بھائی آپ کو آپ کو تازہ کے لئے آٹھے تھے اور مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ آج اتنی سویرے کیسے اٹھ
 بیٹھے۔ اصل میں اس رات مجھے نیند نہیں آئی جانتے کیا ہو گیا۔ رات بھر کو نہیں لیتے کڑ رنگی اور طرح طرح کے خیال دوسرے
 صبح کے ہون میں ایک کچھ لگی سی آئی "کیا دیکھتے ہوں کہ....." وحشی کی زبان ڈرا ڈرا کر کھڑا نے لگی اور بدن میں کچھ لگی سی پید ہو گئی
 "کہہ دیا امام بازہ ہو..... امام بازہ ہے اور اس بڑا ظلم کل رہا ہے بڑا ظلم باہل اسی طرح ہی سبزلہ راجا ہوا کچھ لگتا ہوا چاندنی کا
 بچہ اچھا چمک رہا تھا بچہ ایسا کہ میری آنکھوں میں چپکا چوند ہو گئی۔ بس اس سے میں بھری آنکھ کھل گئی۔"

بشیر بھائی لپٹے سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور آنکھیں انہوں نے بند کر لی تھیں۔ اختر چاہا یہاں صبح عاری ہوا تھا کہ سارا جسم یکے میں آ گیا
 تھا۔ خود وحشی کے جسم میں اب تک ایک ایک کی لگی باقی تھی سید نے بھی کرات کے کران کی طرف منڈ کر لیا تھا بند آنکھیں کھل گئی تھیں
 اور وہ دن کے اندھیرے میں ایک روزانہ دن رہا تھا کہ ایک کران اس سے چھن کر روشنی نکلی رہتی ہوئی اندھ لگتی تھی جسی "مزا خانے کے
 لوہاں سے بے ہونے اندھیرے میں چمکتے ہوئے ظلم چاندی اور سونے کے ضو دیتے ہوئے ٹپٹہ بوہر و سٹار روشنی کچھوں کے سہرے ہو

بکلی گونے سے نکلے ہوئے کنارے لچکھٹ میں آویزاں وہ جھک جھک کرتا ہوا جہاز جس میں شیشے کی سطحیں سفید کوئے داراں کمت پھلیاں تک رہی تھیں جس کی ایک ٹوٹی ہوئی پہلی ہاضمہ مڑھتے پر جانے کہاں سے اس کے پاس آنکھیں تھیں باہر سے سفید اور ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ پہلے کے دیکھتے اور اندر سے ملت رنگ۔

”بہت جاب خواب ہے“ شبیر بھائی اوسے سے بولے۔

اختر اور شی دوئوں نہیں سمجھے گئے۔

شبیر بھائی نے سوال کیا ”تم سو گئے تھے یا...؟“

ہری طرح سو یا بھی نہیں تھا اس ایک پھلکی سی آنکھیں۔

شبیر بھائی سوچ میں پڑ گئے۔ پھر آہستہ سے بولے ”خواب نہیں تھا بہت ہوا ہے۔“ رخصی خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں تھری کی کیفیت دیر سے تھری رہی تھی اب اچانک خوشی کی چمک اُٹھ رہی لیکن جلد ہی یہ ہیرا ماند پڑ گئی اور اس کی جگہ تشویش کی کیفیت نے لے لی۔

”اب کے برس“ وہ گھر متا اندر بھی آواز میں بولا ”ہمارے نام باز سے میں بڑے ملے کا جلوس نہیں نکھاتا۔“

”کیوں؟“

شبیر بھائی اور اختر گھر مند ہو گئے۔

”ہمارے خاندان کے سب لوگ تو ہیں چلے آئے تھے۔ بس میری والدہ وہاں رہ گئی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ مرے دم تک

امام بازوئیں چھوڑوں گی۔ برسوں اکلی عزم کا اظہار کرتی تھیں اور بڑا ملہاں شان سے نکلتا تھا۔“

”پھر؟“

”بہت ضیف ہو گئی تھیں وہ میں پہنچے بھی نہیں۔ لا بس۔۔۔۔۔“ اس کی آواز بھر گئی آنکھوں میں آنسو چمک آئے

شبیر بھائی اور اختر کے سر جھک گئے۔ سداھ کے بیٹے کیا تھا۔

شبیر بھائی نے غصہ سانس لیا۔

”ایک گھر میں رہتے ہو اور تم نے بتایا بھی نہیں۔“ اختر بہت دیر کے بعد بولا۔

”کیا بتاتا“

شبیر بھائی اور اختر پھر گرم ہو گئے۔ ان کے ذہن کچھ غالی سے ہو گئے تھے۔

سید کے ذہن میں روزن مکمل کیا تھا اور کرن اندھیرے میں آڑا تر جھارت بتاتی ہوئی سڑک رہی تھی۔ محرم کے دس دنوں اور جملہ کے کچھ دنوں کے علاوہ سال بھر اس میں تالا چڑا رہا تھا۔ انجان کو جاننے کی خواہش جب بہت زور کرتی تو وہ چپکے چپکے دروازے پر جاتا کنواڑوں کی دڑاڑوں میں سے جھانکتا وہاں سے کچھ نظر نہ آتا تو کنواڑوں کے جڑوں پر بھی رکھتا لالچی ہوئی کڑی کچڑا دروازے سے اوپر والی جالی میں سے جھانکتا رہتا یہاں تک کہ اندھیرے میں نظر سڑک نہ لگ پڑتی اور جھانکنا مسلسل کر لے لگتا۔ بہت دیر ہو جاتی اور اس سے زیادہ کچھ نظر نہ آتا اور اس کا دل رعب کھائے آپ سی آہ جزو کٹے لگتا اور وہ آہستہ سے اتر کر باہر ہوتا تھا۔ تہ خانہ جس کی کھڑکی اندھیرے سے چھلکی تھی اس سے بھی زیادہ تاریک تھا۔ اس کے اندھیرے سے اس پر بد طاری نہیں ہوتا تھا۔ بس ڈر لگتا تھا۔ اس میں رہنے والا کوئی ساہوکار نہیں تھا۔ اگر چہ اس کی روایت کے مطابق ظہیر مجاہد کسی سے کچھ نہ کہتا تھا اور چنانچہ ایک وفد رات کو نہ سنے پڑ جاتے ہوئے ان کا ہاتھ بھی اس کا گلے سے پڑ گیا تھا مگر وہ ظہیر پھلکارے سر سر کرتا ہوا کھڑکی کے اندر گھس گیا پھر بھی کھڑکی میں کھڑے ہو کر جم کے تہ خانے کے اندھیرے کا ہاتھ لپیٹنے کی جرات اسے کبھی نہ ہوئی۔ کوڑیا لے ساہوکار کو وہ کبھی نہ کچھ کا لیکن ہندی جھین کھاتی تھی کس نے اپنی آنکھ سے اسے دیکھا ہے۔

”جھوٹی۔“

”اچھا تو مت ان۔“

”کسم کسم اٹھی۔“

”اللہ کی قسم۔“

اسے پھر بھی ہری طرح جھین نہیں آئی۔ ”اچھا کیا تھا وہ؟“

”کا کا کالے سفیدی کوڑھیں کی کوڑھیں۔۔۔۔۔ میں نے جو جھانکا تو وہاں پہ چڑھ رہا تھا بہت سے میں نے کھڑکی بند کر لی۔“

اس کا دم دھو دھو کر نہ لگا۔ وہ ایک دوسرے کو سمجھنے لگے۔ کبھی کبھی نظر میں دھو دھو کر تے ہوئے دل جڑ جڑوں پہ بیٹھے بیٹھے وہ

ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور اتر کو گھن میں کوئیں کی پکی سن پہ جاتی تھے۔

دوئوں کوئیں میں جھانکتے گئے۔ اچھا لاہم پڑتے پڑتے ہلکا سا یہ بنا جو کبر اہوتا گیا پھر بالکل اندھیرا ہو گیا اندھیرے کی تہ

میں ابریں لیٹا ہوا پانی کی جگہ بالکل کی طرح چمکتا اور اندھیرا ہوتا چلا جاتا جھلکی کالی پڑتی لہروں پہ دو پر جھانکیاں۔

”جی“

”ہٹ ہادی جن کہیں کوئی میں رہتے ہیں۔“

”پھر کون ہیں؟“

اس نے بزرگ انداز میں جواب دیا ”کوئی بھی نہیں ہے۔ تو تو جی ہے۔۔۔ اجماد کچھ میں آواز لگا رہا ہوں۔“ اور اس نے کوئی میں مسئلہ کے زور سے آواز دی ”کون ہے؟“ اندھیرے میں ایک تو کوئی پیدہ ہوئی اور کچھ کالی پڑتی لہریا آواز پیدہ ہوئی ”کون ہے؟“ دونوں نے ذرا کے جلدی سے گردنیں پھر نکالیں۔

”اندھ کوئی ہے؟“ ہندی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

”کوئی بھی نہیں۔“ اس نے اس بے اعتنائی سے جواب دیا۔ جسے وہ بالکل نہیں ڈرا ہے۔ وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر وہ ذرا آپ بے آواز گھس گھسے۔ ہندی نے کچھ بیٹھے سوال کیا ”سید کوئی میں اتنا بہت سا پانی کہاں سے آتا ہے؟“

وہ اس کی جہالت پر ہنس پڑا۔ ”اتنا بھی نہیں پوچھ۔ زمین کے اندر پانی ہی پانی ہے۔ کوئی میں اتنا بہت سا پانی کہاں سے آتا ہے؟“

”زمین کے اندر اگر پانی بھرا ہوا ہے۔“ وہ سوچتے ہوئے بولی ”تو پھر ساپ کہاں رہتے ہیں؟“ ساپ کہاں رہتے ہیں؟ وہ بھی سوچی میں پڑ گیا۔ ساپ پانی کا قصور ہی بس زمین کا بادشاہ ہے۔ زمین کے اندر پانی ہے تو ساپ کہاں رہتا ہوگا؟ اور پھر راجہ کا ہاتھ کا گل کیسے پھانگا؟ اتنی دیر میں ہندی نے دوسرا دل کر ڈالا ”سید ساپ پہلے جنت میں رہتا تھا؟“

”ہاں“

”وہ جنت میں رہتا تھا تو زمین پہ کیسے آ گیا؟“

”اس نے گناہ کیا تھا۔ اللہ میاں کا غضب پڑا۔ اس کی آنکھیں ٹوٹ گئیں اور وہ زمین پہ پڑا۔“ گناہ ہندی کی آنکھوں میں پھر ڈر جھلکے لگے اور پھر دونوں کا دل ہول ہولے دھڑکنے لگا۔

”پھر ہندی کا کھڑی ہوئی“ میں تو یہ اس لگ رہی ہے۔ ہم کھڑے رہے۔“

اس نے جلدی سے من پہ پڑا ہوا چہرے کا دل سنبھال لیا ”کوئی میں پانی نہیں گئے۔ بہت غصہ ہوتا ہے۔“ اور اس نے بھرتی سے کوئی میں ذرا ڈالا۔ اسی کی اگلیں اور دھیلیوں کی جھڑکوں گزرتی جھلکتی تیزی سے گزرنے لگی اور پھر ایک ساتھ پانی کے ذرا کے ذرا جھٹکا سا شور ہوا جس سے اس کے سارے بدن میں مضام کی ایک لہری دوڑ گئی۔ دونوں مل کر بھرا ذرا لپکتے گئے اور

دونوں میں ایک جگہ ہی لذت جاتے تھے۔ بیٹھے ٹھنڈے پانی سے بھرا ذرا دل تمام کے ہندی کے گورے ہاتھوں کی اوک میں پانی ڈالنا شروع کیا۔ گورے ہاتھوں سے غنی ہوئی اٹھوں گہری ہوئی ہوئی اوک موتی سا پانی پٹے پٹے ہونٹ اس نے ایک مرتبہ پانی کی دھارا اتنی تیزی کی کہ اس کے کپڑے تر ہو گئے اور گلے میں چھدا لگ گیا۔

”اصل میں وہ سن کامل تھا۔“ رضی کہہ رہا تھا ”اناری والدہ کے کوئی اولاد نہ ہوتی تھی۔ وہ کر بلائے مٹا گئیں۔ امام کے رونے پر تو ہر شخص جا کے دعا مانگ لیتا ہے وہ صابر ہوئے نامحرم۔۔۔۔۔ والدہ کبھی جس کے چھوٹے حضرت کی درگاہ پہ وہ جلال برستا ہے کہ وہاں وہ داخل ہوتے ہی رشتہ طاری ہو جاتا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ مجروح نہ ہوتا ہو۔ جس وقت والدہ بچتی ہیں اسی وقت ایک جگہ واقعہ ہوا۔ ایک شخص درگاہ سے نکل رہا تھا۔ نکلے نکلے دروازے سے اس کے پیچھے آئے اس کے گلے میں سکا ہے اور بدن سرخ جیسے بجلی گری ہو۔ اس کی ماں زار و قطار رو رہے بہت دیر ہوئی تو ایک عمامہ پاس آیا کہ بی بی تیرے بیٹے سے کوئی ہے اولی ہوئی۔ چھوٹے حضرت کو جلال آ گیا ہے۔ اب تو امام کی سرکار میں جا۔ وہ سنا کہ جس چھوٹے حضرت کو۔ ماں روئی جھٹکی امام کے رونے پر گئی اور مرض پکڑ لی۔۔۔۔۔ اس کی آواز میں سرگوشی کی کیفیت پیدا ہوئے تھی“ اس نے میں کیا دیکھتے ہیں کہ درگاہ میں ایک نور پھیل گیا اور اچانک اس شخص کی حالت درست ہو گئی۔“

”کمال ہے“ اختر نے بہت آہستہ کہا۔

”شیر بھائی نے ایک بھائی لی اور پھر تمہارا ہونے۔“

”اس نے اصل میں بھولی قسم کھائی تھی۔“ رضی آہستہ سے بولا۔

”شیر بھائی اور اختر کی خاموشی سے لاکھ واٹھا کر رضی پھر شروع ہو گیا۔“ ہاں تو والدہ نے کہا جو ہوسو ہورگاہ کے گورے کے جاؤں گی۔ رات بھر مرض کو کپڑے دھوا جلتی رہیں روئی رہیں آخر کے میں ایک ساتھ آکھ جھپک گئی کیا دیکھتی ہیں کہ درگاہ میں شردا دل ہو رہا ہے۔ بزرگ کے آکھ کھول دی۔ سامنے علم پتھر پڑی۔ پٹے سے شعاعیں پھوٹ رہی ہیں اور ایک تار و پتلی کا پھول والدہ کی گود میں آچکا۔۔۔۔۔“

”ہاں صاحب بڑی بات ہے ان کی“ ”شیر بھائی آواز کو اک ذرا اوپر کرتے ہوئے بولے۔ ”وہ علم“ رضی کی آواز میں ایک پر جلال خواب کی سی کیفیت پیدا ہوئی تھی۔ ”اصلی علم ہے۔ فرات سے نکلا تھا۔ مرتع کے سرہانے سبز جگہ میں لپٹا کھڑا ہے۔ جب دید پچھتا ہے اور عاشرہ کو اس سے انکی شعاعیں پھوٹتی ہیں کہ لگا لگا کھس پھرتی“ جیسے سورج چمک رہا ہو۔“

سید کو بجی گئی، لگ رہا تھا کہ شعبہ میں اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دی ہیں اور آنکھوں سے ہوتی ہوئی ذہن کی اندھیری کوٹھڑی میں لہرے پٹائی چل رہی ہیں۔ اندھیری کوٹھڑی کو دس دسی تھی اور اس کے پیچھے گوشے اچالے ہوئے تھے۔ جھگڑاتے اندھیرے منور خواب دیکھا چہرہ حضور نے علم اُپرانی چلتی تھیں۔ چنگ کرکٹ کے پٹائی کو لٹکا کر بندی روکھ کے جاری ہے بندی کرکٹ کر کے جاتی تو دکھائی دینا کہ چنگ کرکٹ کی۔ خواب کہ وہ بیڑیاں لے کر تپا چلا جا رہا ہے۔ جو لہرے نوازی طرح پھیلنے پھٹنے چلی جا رہی ہیں اور چنگ کی ڈور جنگل میں آتے آتے نکل گئی ہے۔ بیڑیاں جو کبھی سرنگ میں سے ہوتی ہوئی لپکتی ہیں اور کبھی فضا میں اوچی ہوئی چلی جاتیں۔ وہ چڑھتا چلا جاتا، چڑھتا چلا جاتا، پھر اس کا دم دھڑکنے لگتا کہ اب گرا پھر کسی کمرے کو میں گرنے لگتا آہستہ آہستہ گرتے گرتے پھر اٹھنے لگتا اور دسے ایک ساتھ اس کی آنکھ کھل جاتی۔

"اماں جی میں نے خواب دیکھا کہ میں زینے پر چڑھ رہا ہوں۔"

"فیجیری خواب ہے چہرہ ترقی کرو گے! پھر ہو گے۔"

"اماں جی خواب میں آکر کوئی چنگ اڑتی دیکھے۔"

"تیس چٹاے خواب تیس دیکھتے۔" اماں جی بولیں "چنگ دیکھا اچھا تیس پریشانی آوارہ وطن کی نشانی ہے۔"

"اماں جی میں نے خواب دیکھا کہ جیسے میں ہوں زینے پر چڑھ رہا ہوں چڑھتا چلا جا رہا ہوں۔ بہت دیر بعد کھڑا آیا اور زینہ قاب۔۔۔ اور میں کوفے چاکلٹ کھڑا رہ گیا ہوں اور چنگ۔۔۔"

"تیس چٹاے خواب تیس ہے" اماں جی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ان بھرتو کوٹھوں چھوٹو کو کھو دے۔ وہ سی سے میں بھی خیال رہا ہو۔۔۔ ایسے خواب نہیں دیکھا کرتے۔"

"اماں جی نے خواب دیکھا کہ جیسے ہمارا کوفہ ہے منڈیر پر پائیک بندر۔۔۔" اماں جی نے بات کاٹ دی اور اب کے ڈانٹ کے بولیں "اچھا اب تو سو دے گا تیس۔"

"اچھا اماں جی وہ کہانی تو پوری کرو۔"

"ہاں تو کہاں تک وہ کہانی ہوئی تھی خدا تمہارا بھلا کرے۔۔۔"

"فیجوری دے ہی چھ کر کون ہو۔"

"ہاں خدا تمہارا بھلا کرے" فیجوری اس کے سر کو یہ بتا دے تو کون ہے۔ اس نے بہت متع کیا کہ ایک بخت تو نقصان اٹھا دے گی

مت ہو چہرہ مشہور اور انوائس کنکشن اتنی لے کے پڑ گئی کہ جب تک تو بتا دے گا تیس بات تیس کروں گی اچھا بی بی تیری جیسا تھا ہے تو چل رہا ہے پادشاہ پادشاہ کا دونوں چل رہے۔ دریا پٹائی گئے۔ یوں لگا دیکھتے مت ہو چہ۔ بولی کہ ضرور ہو چھو کی۔ دور یا میں اترنے لگا پانی سینے تک آ گیا پھر یوں لگا کہ ایک بخت مان جا مت ہو چہ۔ بولی کہ ضرور ہو چھو کی۔ پھر گردن تک آیا۔ پھر متع کیا پھر نامانی۔ پھر منہ تک آیا۔ پھر کہا کہ دیکھ پچھتاوے کی اب بھی وقت ہے۔ اس نے کہا ضرور ہو چھو کی۔ اس نے کہا ضرور ہو چھو کی۔ اس نے غوطہ لگا لیا۔ اندر سے کالا چمن لگا اور پھر پانی میں غائب ہو گیا۔"

"چاندی سے اس بھول کوں کر کے علم ہوا یا تھا۔ اسی سال میری پیدائش ہوئی۔" "حیرت کھتا چاہیے اسے" "شیر بھائی بولے۔" "مگر۔۔۔" "رضی کی زبان اڑکھڑانے لگی اور بدن میں رشتہ پیدہ ہو گیا۔" "مگر وہ۔۔۔" "کیا مطلب؟" "شیر بھائی نے سوال کیا۔"

"وہ علم غائب ہو گیا۔"

"کیسے؟" "شیر بھائی اور ستر دونوں چوک چڑھے۔"

"اس سال ملوں نہیں لگا۔" "رضی کے بدن میں اب تک ترھری تھی۔" "ایک وارے پڑوسی ہیں۔ کہتے تھے کہ امام باز سے میں اس رات کسی نے چروغ تک نہیں جلا یا۔" "سج کی نماز کو میں اٹھا تو دیکھا کہ امام باز سے میں تیس کی روشنی اور ہی ہے منج کو کھاکے دیکھا تو یہ اجڑا ٹھہرا یا کہ سب علم رکھے ہیں بڑا علم غائب۔۔۔"

دھندلاتے ہوئے اندھیرے پھر روشن ہونے لگے۔ کنوئیں کی من پٹیشے بیٹھے اپنا کھمپ میں ایک سایہ ڈال گاتا نظر آیا۔ "چنگ" اور دونوں تیری کی طرح زینے سے جلدی جلدی بیڑیاں چڑھتے ہوئے کوفے پہ ہو گئے۔

"کہہ کر گئی؟" اس نے چاروں طرف لگا دوڑائی۔

"بندی نے دوق سے کہا۔" "گری تو اسی صحت پہ ہے۔"

"اس صحت پہ ہے تو پھر کہاں ہے؟"

اور ایک ساتھ بندی کی گرفت اس کی آستین سے پھر آستین کے ساتھ بازو پہ پکڑتی چلی گئی "سید۔۔۔۔۔ بندر۔۔۔"

ووڈر گیا "کہاں؟"

"وہ" اس نے آنکھوں سے دیر کی طرف اشارہ کیا۔

دیر اور پائیک بڑا سا بندر بیٹھا تھا۔ دونوں کو دیکھ کے دھچکے دھچکے ایک ساتھ کھڑا ہو گیا اور بدن کے سارے بال سید کے کانوں

کی طرح نکڑے ہو گئے۔ ان کے پاؤں جہاں کے تہاں بندھے اور جسم کن پڑ گیا۔ بندر کھڑا باغریا بھڑا ہشتا ہستہ منڈر پر پو پٹا ہوا دایہ دار کے سہارے نیچنگلی میں اترے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

جب وہ وہاں نہینے پہنچے تو دل دھڑ دھڑ کر رہے تھے اور بدن سے پینے کی کیاں چل رہی تھیں۔ بندی نے اپنی ٹھیں سے منہ پر ٹھٹھا کر دیا صاف کی کبڑی ہوئی ٹیٹس سنواریں۔ پھر وہ دونوں بیڑی پہ بٹھ گئے۔ اس نے سبھی کبھی نظروں سے بندر کو دیکھا جس کی دہشت زدہ آنکھیں نہینے کے اندھیرے میں چمکھ اور زیادہ دہشت زدہ لگ رہی تھیں۔ وہ دہڑا گیا۔ "چلو" بے ارادہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں میزبان اترنے لگے۔ اترتے اترتے موڑ پہ وہ رکا اور اندھیرا نہینے سے باہر روشن دان میں دیکھنے لگا جس میں سے وہ نظیر آنے والا میدان اور اس سے پرے پھیلے ہوئے درخت ایک ایک ٹپپا دینا لگتے تھے۔

"اگر ہم دیکھو" بندی نے اسے فخر دار کیا۔

"کیوں؟"

"اگر ایک جاہلو گرانی راتی ہے۔" وہ اپنی دہشت زدہ آنکھوں کو چمکا کے کہنے لگی۔ "اس کے پاس ایک آئینہ ہے جسے وہ آئینہ دکھاتی ہے وہ اس کے ساتھ لیتا ہے۔"

"بھئی؟"

"اٹکی جسم۔"

اس نے ڈرتے ڈرتے ایک مہرچہ پھر دوشمان میں سے بھاگا۔ "کیس بھی تیس ہے۔"

"اچھا میں دیکھوں" وہ دوشمان کی طرف بڑھی۔

اس نے بہت کوشش کی لیکن روشن دان تک اس کا منہ نہیں پہنچ سکا۔ اس نے لہجہ سے کہا "مید نہیں دکھاوے۔"

اس نے بندی کو اس انداز سے سہارا دیا کہ بیڑی سے اس کے بچہ اٹھ گئے اور چہرہ روشن دان کے سامنے آ گیا اور اسے لگا جیسے ٹپپے پانی سے بھرا دل اس نے قہر کھا ہے۔

اندھیرے میں اترتی ہوئی کرن الہ کر نوٹ گئی۔ اس نے کر نوٹ لیا اور اٹھ کر چلے گیا۔ اختر بشیر بھائی رضی جنہوں سے پڑے تھے۔ بھر پور بھائی نے تو باقاعدہ غرائے بھی لینے شروع کر دیے تھے۔ چاند چڑھنے لگا تھا اور چاندنی اس کے سر ہانے سے اترتی ہوئی پائنتی تک پھیل چلی تھی۔ وہ اٹھ کر مندر کے نیچے والی اندھیرے میں چھپی ہوئی اس نالی پر پہنچا جو برسات میں بارش کے پانی

کے ٹکاس کے لئے باقی دونوں پیشاب کرنے کے کام آتی تھی۔ پھر وہاں سے اٹھ کر اس نے صراحی سے شیشے کے گلاس میں پانی اٹھا اور شفٹ بھر گلاس پی کیا۔ اب خاصا ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ کرنے میں دگی ہوئی ڈائٹین کو اس نے دیکھا کہ بچھ بچھ ہے۔ چار پانی پو پٹتے ہوئے اس کی نظریں پڑی پڑی اور اسے گمان ہوا سا ہوا کہ وہ ابھی سو یا نہیں ہے۔

"رضی"

رضی نے آنکھیں کھول دیں۔ "ہوں"

"سوئے نہیں تم؟"

"سوئے لگا تھا کہ تھاری آہٹ سے آنکھ کھل گئی۔"

دونوں چپ ہو گئے۔ رضی کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔ اختر اور بشیر بھائی اسی طرح سوئے تھے اب اختر نے بھی آہستہ آہستہ اترنے لینے شروع کر دیے تھے۔ اس نے لمبی سی جہاں لی اور کر نوٹ لینے ہوئے پھر رضی کو لپکھا "رضی سو گئے کیا؟"

رضی نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ "نہیں جاگتا ہوں۔" اس نے نیند سے بھری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"رضی" اس نے بڑی سادگی سے جس میں دکھی ایک مرق بھی شامل تھی پوچھا۔

"مجھے آخر خواب کیوں نہیں دیکھتے؟"

رضی ہنس دیا۔ "اب ضروری تو نہیں کہ ہر شخص کو روز خواب ہی دیکھا کریں۔"

دونوں پھر چپ ہو گئے۔ رضی کی آنکھوں میں خند تیر رہی تھی۔ وہ کر نوٹ لے کر پھر آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا کہ سہنے اسے پھر غائب کر لیا۔ "میں نے بچپن میں ایک خواب دیکھا تھا کہ..... ایک جنگ کے پیچھے میں نہینے پر چڑھا ہوں اور بیڑیاں ہیں کہ...."

"یہ خواب ہے؟" رضی ہنس دیا "بھئی پتہ تو دھرا دھر کے خیالات ہوتے ہیں جرأت کو سوتے میں سامنے آ جاتے ہیں۔"

سید سوچ میں پڑ گیا۔ کیا واقعی وہ خواب نہیں ہے۔ وہ سوچنے لگا تو پھر کیا اس کی ساری زندگی ہی خوابوں سے خالی ہے۔ اسے کبھی کوئی خواب نہیں دکھائی؟ اس کے تصور نے فضا سے جھلک جرتے کئی ایک گالوں کو چنگی میں بکرا کر پھرا سے یاد آ گیا کہ وہ خواب تو جس اصل واقعات ہیں۔ اس نے اپنی پچھلی زندگی میں لگا دو روزانی ہر واقعہ میں ہر گوشے میں ایک خواب کی کیفیت دکھائی دی مگر کوئی گرفت میں نہ آ سکا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ خواب اس کے باقی میں دل مل گئے ہیں یا وہ کوئی ابرق ملا گال ہے کہ

دشمنی کے دنوں نے اس میں دکھ تو پیدا کر دی ہے مگر وہ الگ نہیں چلنے جاسکتے یا نام باز سے میں ٹھکے ہوئے جھڑکی کوئی بھلی ہے کہ باہر سے سفید اندر رکھ ہی رنگ جنہیں باہر نہیں نکالا جاسکتا۔ یا کتوں کی گہرائی میں چمکا کا پڑائی کہ دونوں میں فرق نہیں کیا جاسکتا۔
”رضی جائے ہو۔“

”ہوں“ رضی کی آواز خود کی سے پرمعش ہو چلی تھی۔

”اب اسے طویل خواب کے بعد کوئی کیا خواب دیکھے۔“ وہ بڑبڑانے لگا۔ ”مجھے تو اپنا وہ مکان ہی ایک خواب سا لگتا ہے۔ نیم تاریک ذہن پلٹے ہوئے نگاہ کر سڑک میں چل رہے ہیں۔ ایک موڑ کے بعد دوسرا موڑ دوسرے موڑ کے بعد تیسرا موڑ انہوں معلوم ہوتا کہ موڑ آتے چلے جائیں گے۔ سڑکیاں بھٹکتی چلی جائیں گی کہ راستے میں ایک دم سے کھلی روش چھت آ جاتی لگتا کہ کسی اجنبی دیس میں داخل ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی تو اپنی چھت پہ چب ویرانی ہی چھائی ہوتی۔ اوٹے والے کوٹھے کی منڈ پر پوٹی بندر اوجھتے اوجھتے سو جاتا جیسے اب کبھی نہیں اٹھے گا۔ پھر کبھی ایک ساتھ بھر بھری لیتا اور کوٹھے سے کچے چھت پہ اور کچے کی چھت سے ذہن کی طرف ہم دونوں کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے ذہن کی سڑکیوں پر اترتا رہتا نیچے آیا۔ ہم دونوں کے ستون کے چپے چپکے گئے۔ کتوں کی من پہ چا بیٹھا پھر غائب ہو گیا یا شاید کتوں میں اتر گیا ہو۔“

رضی کی خند غائب ہو گئی۔ اس نے غور سے سید کی طرف دیکھا۔ وہ پھر دل میں گویا ہوا۔ ”ہم کتوں میں چھٹ جائیں گے۔ پھر ہم زور سے چلائے“ کتوں نے؟“ سارا کتوں کو گنج کیا اور ایک لہریا کرن پانی میں سے اٹھ کر اندر جیسے میں چھٹ جاتی مل کاتی باہر نکلی سارے آگن میں بھیل گئی جیسے کسی نے رات میں مبتلا ہی چلائی ہو۔ چمکتے ہوئے پانی پہ ایک کس تیر رہا تھا۔ ”چٹنگ“ میں نے نظر اوپر کی۔ ایک بہت بڑی ادھ کی چٹنگ آدھی کالی آدھی سفید کئی تھی۔ اور اس کی ڈور کہ دھوپ میں باز لے کی طرح جھللا رہی تھی۔ منظر پر سے آگن میں آگن سے میرے سر پہ میں نے ہاتھ بڑھا یا مگر ہاتھوں میں سے نکلتی چلی گئی۔ میں تیر کی طرح ڈوبنے میں دوڑا ذہن میں اندر میرا تھکانے کی کڑکی کے پاس نکلتی کے میرا دل دھڑکنے لگا میں نے آنکھیں میچیں اور اوپر چڑھتا چلا گیا۔ ایک موڑ دوسرا موڑ سڑکیاں پھر سڑکیاں اس کے بعد پھر سڑکیاں جیسے چڑھتے چڑھتے صدی گزر گئی ہو پھر کھلا نہ آ گیا مگر سڑکیوں کا پھر وہی پھر سڑکیاں اور پھر سڑکیاں اور پھر“

”یاد تو خواب کی ہی باتیں کر رہے ہو۔“ رضی نے حیران ہو کے اسے دیکھا۔

چاند اوپر چڑھا یا تھا اور چاندنی اس کی پانچ سے اترتی ہوئی سامنے والی دیوار کے کناروں کو چھونے لگی تھی۔ صراحی کے برابر

رکھا ہوا گلاس کبھی کبھی سے ہوں چمک رہا تھا جیسے اس میں چند کرنیں مقید ہو گئی ہوں۔ شیر بھائی اور اختر بدستور سارے تھے۔ نکلی ہو جانے کی وجہ سے شیر بھائی نے دھوٹی سر ہانے سے بنا کر اپنے اوپر ڈال لی تھی اور اختر کی جاکوں پر پڑی ہوئی دولائی اب بیٹے تک آ گئی تھی۔

”سید“

”ہوں“ سید کی آواز میں خود کی کا ڈھپیدا ہو چلا تھا۔

”سور ہے ہو؟ یا میری خندا آگئی۔“

سید نے خند سے پرمعش آنکھیں کھولیں رضی کی طرف دیکھتے ہوئے پر اسرار لہجہ میں بولا۔ ”میرا دل دھڑک رہا ہے کوئی خواب دیکھنے کا آٹ“ اور اس کی آنکھیں پھر بند ہوئے نکلیں۔



مردہ راکھ

کہتے ہیں کہ اس برس سواری نہیں آئی تھی۔ یہ بڑاظم کو ہونے کے ایک سال بعد کا واقعہ ہے۔ بڑاظم پہلے گردی رکھا کیا تھا۔ پھر سونے کے کئی علم اڑے کر اسے مین تو عزم کو چھڑا دیا گیا۔ جب وہ سما کر بلند کیا گیا تو دیکھا کہ دو سرخ انگارہ ہو گیا ہے۔ سرخ انگارہ بچہ پہلے بہت دیر تک ہڑا رہا۔ مولوی فرزند علی کا بیان ہے کہ اس نے خون بھی پکا تھا۔ پھر جب زیارت کے وقت اسے عزائے سے باہر لگایا گیا تو علم بہت زور سے کانپا اور پھر قنصل کے ہاتھ میں خالی چھڑو گئی جس اس کے اگلے برس یہ واقعہ ہو گیا۔ تو اس برس عزائے خاتون میں سواری نہیں آئی تھی۔

عزائے خاتون کی زینت تو اسی طور ہوئی علم سے چھ مہاڑے خاتون اور ہانڈیاں روشن ہوئیں اور لوہان اور اگر جتیاں لٹکائی گئیں اور تاش پارتیاں چاند دیکھتے ہی نکل پڑیں مگر بھرا دیا ہو کہ قنصل جو ماتم کرنے تاش بٹھانے اور کھاروں والے علم کو گردش دینے میں سب پر سہمت رکھتا تھا تو وہی ہی در میں آتا کیا۔ پھر آخر بھی تھک گیا۔ پھر تاش پارتی ساری بکھر گئی۔ پھر نام پازوں میں کھٹ کرنے والے کہ چاند تاش کو رات گئے تک عزائے خاتون میں کھوتے پھرتے تھے۔ اس خاصاں بٹھاتا اسے اس اس کو کھروں کو کھوتے تھے اور چاند رات اس میں شروع رات ہی میں سولی ہو گئی۔

دوسرے دن مولوی فرزند علی علم کی زیارت کر کے آجڑیہ باہر نکلے اور بولے کہ "امام کی سواری نہیں آئی" اس پر دل سب کے دھڑکنے لگے اور بہت دوسرے لوگ اور گمان پیدا ہوئے مگر کسی کو کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ بس کچھ غرض کر جاتی تے جنہوں نے ایک سال کر بلا میں عزم کئے تھے اور اپنی آنکھ سے دیکھا تھا کہ اس دن تک کہ بلا درین رسی کہ امام کی سواری ہند کی طرف گئی ہوئی تھی۔ خطہ سانس پھر اوارہ ہو کر کہ "اللہ ہم پر رحم کرے۔"

پھر چالیس شروع ہوئیں اور زیارت میں نکلے لگے۔ چاندی سونے کے جگمگاتے بچوں والے رنگ رنگ بچوں والے ان گنت علم اواران کے آگے آگے دو کھاروں والا اونچا علم قنصل۔ خاصے سے علم کو گردش دیتا ہوا چلا۔ مگر پھر اس نے علم دوسرے کے حوالے کر تاش گلے میں ڈال لیا۔ تاش اس نے بھاپا مگر کچھ شایہ دل سے نہیں پھیل گئی تھی کہ اس کا ہاتھ کسی طور نہ جتا۔

پھر اس نے تاش آخر کے گلے میں ڈال دیا۔ تو وہی دور چلا پھر جلوس ختم ہونے سے پہلے ہی کت کر گھرا میں ہو گیا۔ آجھ عزم کو کچھ واقعہ ہوا بڑے امام پاڑے سے جب وہ ابمتاج برآہ ہو تو زیارت کرنے والے حیران رہ گئے۔ دلدل کہاں گیا۔ پہلے یہ سوال آگھوں میں کیا گیا۔ پھر گروٹھیں میں ایک نے ایک سے پوچھا "آ کر دلدل کہاں گیا؟" کچھ اس کے رنگ سے کچھ یہ دیکھ کر اس نے کئی مرتبہ دو تھپتھپکی جھکی جس اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری نہیں تھے سب نے جان لیا کہ یہ وہ گھوڑا نہیں ہے۔ جو دلدل بنا کر تھا۔ مولوی فرزند علی نے رو کئے لپٹ میں کہا "وہ گھوڑا امر گیا؟"

"وہ گھوڑا امر گیا؟"

"دلدل؟ دلدل؟ کون کہا ہے؟"

پہلے کسی کو کھنسن نہ آیا۔ مولوی فرزند علی نے کسی کو کھنسن دلانے کی کوشش بھی نہیں کی تو کوں کو راتہ راتہ خودی چھین آ گیا۔ انہیں ایک دم سے اگلی پھیل ساری باتیں یاد آ گئیں۔ انہیں وہ دن یاد آیا کہ جب پہلی بار کسی نے آ کر تاشا تھا کہ دلدل کے ساتھ کیا کچھ ہوا ہے۔ تراب علی حلی سے حلی بننے ہی وہ کچھ کیا تھا کہ اب کسی کے دل میں ان کا زور بہت اہم نہیں تھا۔ وقت کی گھلسوں سے تھک کر یہ رم اٹھ گئی اور بڑے امام پاڑے کے گھن میں جلی ہوئی وہ بھلیاں اور تھوڑے جو کچھ سے گرم ہو جایا کرتے تھے اب غصہ سے پڑے رہتے اور صرف آٹھ کی شب کو اور عاصروہ کی سر پیر کو گرم رکھائی دیتے۔ تراب علی حلی کہتے تھے کہ چیزیں بہت مہنگی ہو گئی ہیں۔ میدانوں کی زمین نہیں جتا۔ مولوی فرزند علی تک جب یہ خبر پہنچی تو انہوں نے بہت سراسر میں کہا کہ "کچھ چیزیں مہنگی ہو گئی ہیں اور کچھ وقت کی آمد کی کم ہو گئی ہے۔"

افغان حسین نے نگار کا پایا "پس کچھ وقت کی آمد کی کم ہو گئی ہے کچھ دوسری دھواں میں خرچ ہونے لگی ہے۔" گھر اس ساری بیج اری سے باہر جو اس خبر پر کسی کو اعتبار نہ آیا۔ کوئی لاکھ بے ایمان ہو گیا ہو مگر یہ نہیں کر سکتا کہ دلدل کے دانے پانی میں سے اٹھائی کر لے گئے جس شخص نے دلدل پر ہنر پڑے دیکھا تھا وہ یہ خبر سنا کر خودی چور بن گیا اور اعتبار نہ کرنے والوں کی برہمی سے ڈر کر اپنا بیان بدلتا چلا گیا اور آخر میں یہ کہہ کر چپ ہو گیا کہ "مجھے شک سا ہوا تھا۔ شاید لکھنؤ مگر شرافت نے ہارے وثوق کے ساتھ اپنا بیان بدلا دیا۔ قنصل تاشا کھا کر اسے مارنے کے لئے نکھڑا ہو گیا اور اس کے بعد سب کو کھنسن ہو گیا کہ شرافت بدالی ہو گیا ہے مگر اب دوسب خبریں جی نکھیں۔ مولوی فرزند علی پھر بھی کچھ نہیں بولے۔ بس انہوں نے ایک ہی فقرہ کہا "جو شخص بڑاظم گردی رکھ دے اس سے کوئی بات بھی ہیہ نہیں ہو سکتی۔"

تفطیل جلوس کے ساتھ دور تک گیا۔ لیکن وہ تاشہ نہ لگا سکا کہ آج اس کے بازوکل سے بھی زیادہ دکھ رہے تھے۔ اسے دور دور کر لدل کا خیال آتا۔ سنیہ صاحبہ ساجسم پالا قذوہ لگی ہوئی گردن چھوٹی چھوٹی کالیاں "گول گول" مسم ہوتی ہوئی چٹکی جلد میں کتبہ میں چاروں تاج معلوم ہوتا۔ برس کے برس آٹھ کی صبح کو لگی کپڑوں کی پردہ باز آواز سنائی دیتی اور پھر بڑے امام باڑے کے پچھلے والے احاطے میں ہم کی چھان میں صاحب سے بنی ہوئی ایک حلقہ کھڑی دکھائی دیتی اور بچے دور دور کی گلی سے آتے اور نیم سے دور کھڑے ہو کر سے حیرت سے دیکھتے رہتے۔ "تفطیل بھائی یہ بدل ہے؟" کوئی بچی حیرت سے بے قابو ہو کر آفر سوال کر بیٹھتا۔ "ہاں لدل ہے۔" اور انھیں دو کھڑے رہنے کی ہدایت کر کے پھر اس کی آرائش میں مصروف ہو جاتا تو خود سے قہقہے سے ہنسنے کے بعد کچھ باتیں اسی افسانہ دانوں کی پھیلیاں ترتیبیں اور انھوں اور قہقہے سے لگتے ہوئے سانس کی آواز جادو جیز ہو جاتی اور بچے کہہ کر پیچھے ہٹ جاتے اور ایک مقدس رعب سب پر غاری ہو جاتا اور پھر کوئی بچی پچھنے سے کسی سے بچتا "یہ لدل ہے؟" اور کوئی دوسرا حیرت سے جواب دیتا "ہاں لدل ہے۔" اور جب سرخ دھبوں والی اور حیرتوں سے چھدی ہوئی چار چار ہانڈا ڈھال کر اور پھولوں کے گہروں سے بچ کر وہ عرا خانے میں جاتا تو جی جی لدل بن جاتا۔ اس کے جسم میں ایک ہلکا سا رشہ دوڑ گیا۔ کہیں گھبراؤ گھوڑا۔ اور آخر نے بڑھ کر کھاروں والا علم اس کے ہاتھ میں تھا تو اسی اس نے محض فریضے کے طور پر اسے تھا۔ پھر مضعداری کے طور پر اسے گردش دینے لگا۔ اس کے بازو دکھ رہے تھے۔ علم کو وہ پوری شدت سے دھماکا۔ پھر اس نے علم کا کھینچنا چاہا اور رینک سے کھڑا ہوا۔ یہاں تک جلوس کے بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور اسے داد اور حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے اس کا حوصلہ بحال ہو جاتا تھا۔ اس بلند علم کو دائوں میں تھا تو اسی بچے ہاتھ باندھ گردن پیچھے کی طرف ڈال زمین پر پاؤں بٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ سارا جلوس اس کی نظروں سے اچھل ہو گیا۔ اس کے دائوں میں علم تھا اور اس کی نظروں میں اس کی کھاروں پر بھی جیس کھارے فوراً احساس ہوا کہ دائوں کی گرفت داخلی پڑ رہی ہے اور علم جھٹکا جا رہا ہے۔ اس نے ہاتھ پا کر پیچھے بندھے ہوئے ہاتھ کھول کر علم کو سنبھالے مگر وہ اپنے جسم کو حرکت نہ دے سکا۔ اسے لگا کہ اس کے بازو ٹھیس ہیں۔ اور اس کی آنکھوں میں اندھیرا آئے لگا۔

گرتے ہوئے علم کو آخر نے تھا۔ تفطیل پیٹنے میں نہا کیا اور جسم اس کا ٹوٹنے پٹنے کی طرح لرز رہا تھا۔ پیٹنے میں نہا ہوا صحر سے دل اور کچھ پیٹنے کے ساتھ وہ قہقہے دور چلا آئے۔ بہت سے جلوس سے باہر نکل آئے۔ جلوس کو اسلٹا پھینکا چھوڑ کر بارے ہوئے سچائی کی مثال گھر کی طرف چلا اس احساس کے ساتھ کہ اس کے بازو مضمت سے تڑپ رہے ہیں اور اس کے اندر ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔

اس رات بہت برسا رہا۔ امام باڑوں میں کھلوس سے پہلے اور بعد وہ لوگ جن کا گھوڑا امر کیا تھا۔ سرکوشیوں میں اونچی آوازوں

میں بہت باتیں کرتے رہے۔ دوسرے اور ٹک ٹک خائبر کے گئے عمر واضح طور پر یہ کوئی نہیں بتا سکا کہ یہ واقعہ اصل میں کیا ہوا ہے۔ بس ان لوگوں کو جن کا گھوڑا امر کیا تھا ایک دھندلا دھندلا سا احساس تھا کہ ان کے گھوڑے کوئی جیتی جاگتی چیز تھی کہ آج مر گئی ہے۔

"جو بڑا علم گردی رکھے پھر وہ کبھی کبھی کر سکتا ہے۔"

مولوی فرزند غلی کی اس بات پر سب چپ ہو گئے۔ افغانل حسین نے آہستہ سے کہا۔ "کچ ہے" اور وہ اس کی شب قہمی اور بڑا علم لگنے کا وقت قریب آچکا تھا۔ اندر بڑے امام باڑے میں لوگ بچے ہو رہے تھے اور ادا حلیں والا ڈگر مٹا رہا تھا۔ سب نے ٹھٹھے تھے۔

آخر یہ آئے تھے کہ وہ اصل طرح تھا۔

محمود علی کر بلائی کہنے لگے۔ "اصلی ہی سمجھو۔ جس تو اصل علم جعفرات کے کنارے ملا تھا وہیں رہا۔ آج بھی موجود ہے۔" "محمود علی کر بلائی جسم کو ہلکا سا رشہ آگیا اور آواز گہری ہوئی پانی کئی" "جوتے حضرت کی شریعت مبارک پر سچا ہے۔ سبحان اللہ کیا وہ بچہ ہے۔" رعب اور احرام سے سب کے سر جھک گئے۔

محمود علی کر بلائی پھر بولے "وہ علم اس علم سے کسی کی ہوئی چاندی سے تیار ہوا تھا۔ اسے بھی اصلی ہی سمجھتا چاہیے مگر اب وہ کہاں ہے۔ ہماری بدلتی کہ ہم اصلی علم سے سرفراز ہونے اور اسے ہم نے کھو لیا۔"

آخر نے جاتے کو کھولنا تھا کہ دیکھا اور پھر آگ کے سامنے کر دیا۔ پھر کہنے لگا۔ آج اگر وہ بڑا علم ہوتا۔۔۔۔۔ جب اس وقت اتنا جال تھا تو آج تو قریبی نوٹ پڑتا۔

اس پر افغانل حسین نے جھرجھری کی اور بولے "مغزے کے دن کی بات کرتے ہو میں موجود تھا۔ اس وقت میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ سرخ لگا رہا ہو کیا وہ سورج کی طرح کا نکلتا تھا۔ جب جلال کا عالم تھا۔ کہتے ہیں "خون بھی نکالتا تھا۔"

پھر سب کے سر جھک گئے۔ تفطیل نے خاموشی سے اچھٹن کا ایک کیمک لپٹا۔ اور ادا میں ڈال دیا۔ الا سے نہیں اٹھتے تھیں۔

مولوی فرزند غلی دور بھری آواز میں بولے "علم میں کھو گیا ہے۔ اور لدل کی ہم نے۔۔۔۔۔" وہ بولتے بولتے چپ ہو گئے پھر

بولے اب رو کیا گیا۔۔۔۔۔ اب کیا رو کیا ہے۔ نیکیاں روگرداں ہو گئیں اور حق پر عمل نہیں ہوتا۔ اور باطل سے پرہیز نہیں کیا جاتا۔ کج فرمایا تھا آپ نے۔ بہت کج فرمایا تھا" مولوی فرزند غلی کی آواز رقت سے کانپنے لگی تھی۔

تفطیل مولوی فرزند غلی کی صورت سمجھنے لگا۔ اس نے تفطیل کی کہ جسے کچھ کہنا چاہتا ہو مگر پھر اس نے اپنے تاشے کا رخ بدلا اور الا سے نظریں ہٹا دیں۔

”کیوں صاحب یہ قہقہہ علی والا دے دیا؟“ انفعال حسین نے سوال کیا۔

مولوی فرزند علی نے خشک لہجہ میں کہا: ”آگے تو نصف علی والا دے دیتا۔“

”صاحب یہ ایمانی کی بھی حد ہوتی ہے“ انفعال حسین کہنے لگے ”آگے بڑے علم پر بیڑ مال تسلیم ہو کر تھے اور دودھ کے شربت کی بجائے گلی تھی۔ شیر مال تو پچھلے برس ہی بند ہو گئے تھے اب کے خالی پانی کا شربت دے دیا۔ پچھلے برس میدہ مہکا تھا۔ اب کے کہتے ہیں کہ دودھ کا ڈھڑا ہے۔“

”اگلے برس پچھلی نہیں ملے گی۔ شکر شربت ہوگا۔“ اختر نے غصہ میں کہا۔

”اگلا سال کس نے دیکھا ہے“ محمد حوض کر بلائی بولے۔ ”دقت کی ساری جانکاد گروہی پڑی ہے۔ جانے کیا انجام ہو۔ بڑے امام پاڑے میں اب عزاداری روگئی اسے قنیت جانو۔ اگلے سال کیا خبر ہے۔ ۱۹۱۲ء کی ہو گیا خبر ہے نہ ہو۔“

مولوی فرزند علی کہنے لگے۔ ”بہ نسبتوں کا پھل ہے۔ آگے کیا ہوگا پکائی نہ ہوئی تھی۔ آصف الدولہ کے زمانے میں کیسا کال پڑا تھا۔ اسی زمانے میں گھسٹو کے بڑے امام پاڑے کی نیم رکھی گئی۔ ملت کال پڑا تھا۔ غفلت میں تراوتر اوپر چڑ گئی مگر گھسٹو میں کوئی ہموکا نہیں مراد۔“

”صاحب ان دنوں کال کا زمانہ بھی اچھا خاصا ہوتا تھا۔“ محمد حوض کر بلائی غصہ سانس بھر کر بولے۔ ”اور تو اب آصف الدولہ کی رعایا پروری کی کیا بات ہے جس کو شہر میں صلاساں کو میں آصف الدولہ۔“

فتعل نے الا کے سامنے رکھنا ہوتا تھا اپنی طرف کھینچا اور اٹھیں سے ہٹا کر دیکھا شرافت پاڑے سے تیزی سے نکل کر آیا۔ ”علم اٹھنے والا ہے“ شائے والے حضرات تیار ہو گئے۔ ”اور دوسری دور گیت کی طرف جا کر آتھوں سے جوصل ہو گیا۔ گیت سے جاسوں کی ایک ٹوٹی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی داخل ہوئی اور الا کے پاس سے گزرتی ہوئی امام پاڑے میں سے چلی گئی۔ مولوی فرزند علی اٹھ کھڑے ہوئے“ آفریقہ تو سن ہی لینے پائٹل۔ اب سر شیعہ فہم ہو رہا ہے۔“

فتعل نے اپنا تاٹا پھر الا کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے نکت بھرا ہند من الا دس الا اور بھوکا اٹھنے والے فطلوں سے اس کے دھار چھتاڑھے۔ اس کا شکر گرم ہوئے میں اب بھی ایک آٹھی کی کرباقی تھی۔ ہاتھوں نے شائے میں گھس ڈال لئے تھے اور کوئی تھی سے کوئی اٹھ رہے تھے کوئی انگشت شہادت کو دہرا کر کے اپنے اپنے شائے کو ٹھوک بھرا ہاتھ۔ شائوں کی ان مدھم آوازوں سے خفا میں ایک کوچ پیدھا تھی۔ تھوڑوں والا علم آ پچھلا تھا۔ اور اختر نے کئی بار سے گردش دی اور کئی بار پھیلی پر دھکر بلند کیا۔ فتعل شائے سے

بے خبر ہو کر گردش کرتے تھوڑوں والے علم کو دیکھتا رہا۔ پھر اسے جبر جبری آئی۔ شائے الگ رکھا رکھنا کھڑا اور اختر کے ہاتھ سے علم کے کڑھی میں تو لا۔ پھر دلوں مضمین میں تمام کر بلند کیا۔ پھر آہستہ آہستہ دو تین بار گردش دی۔ پھر اسے تیزی سے گھمانے لگا۔ دیکھتے دیکھتے اعلا تو کون سے بصر کیا تھا اور ایک دہے بے شمار سے خفا کو بچے گئی تھی۔ اس کے گرد ایک جھوم جھوم ہو چلا تھا۔ کسی کی نظر اس کی تواتر مضمین پر تھی۔ کوئی گردش کرتی چلتی تھوڑوں کو نکلتا تھا۔ اس کا خون گرم ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے علم کو اور تیزی سے گھمانا شروع کیا۔ پھر رفتہ رفتہ اور گرد کو دھرا اس کے ذہن سے گھوہنے لگا۔ وہ شہر دھوکا دھوکا والا دے دے گرم ہوتے تھے شائے اور دھار کے کبھی کبھی آہستہ سے بچا اٹھنے والا تھا۔ پھر ایک ایک آنکھوں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ دھوکا اور اس کے ہاتھوں میں گردش کرتا ہوا علم اور علم کی بلندی پر اندھ جیسے میں چلتی گھومتی دھوکا میں اس نے ایک ایک ہاتھ رکھا اور تھوڑا ہی آگاہیں میں لڑ کر چھٹا اٹھیں۔ پھر اس نے اپنا بازو دھکا دھکا اور اٹھلی پچھلی پر علم لٹا لٹا۔ پھلی پر علم لٹا لٹا۔ پھر علم کو بلند کیا اور اوپر چڑھوا تو اس میں داب رکھنا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ پچھے ہاتھ رکھے تھے اور قدم زمین پر تھے تھے اور گردن پچھلی کی طرف ڈال کر مت آسان کی طرف اٹھنا تھا۔ اعلا میں بھرے ہوئے لوگ ان کی باتیں ان کا شور امام پاڑے سے آتی ہوئی سر پے کی آواز سب کچھ اس کے ذہن سے گھوہ گیا تھا۔ اس نے جانا کہ دو زمین اور آسان کے درمیان پچھلے ہوئے اندھ جیسے کے بچا اٹھنا ہے۔ اس کا مت آسان کی طرف تھا اور آہستہ آہستہ زلزلہ کی تھوڑوں کی چٹک اس کی آنکھوں میں پچھلی اور اندھ جیسے میں گم ہو جاتی۔ اس کا بازو اٹھنے لگا تھا اور سانس تیز ہو گیا تھا۔ فطلا نے خیال آ کر میرے بازو کھان لٹا بازو کھان گئے اور اس نے علم کی چھڑ کو اور بازو دھوکا دھوکا سے دھوکا میں پکڑ لیا اور اس کی کٹھنی گرم ہوئی چلی گئی اور آتھوں میں اندھیرا آ گیا۔ ”علم نکل آ یا ہے“ ایک آواز جیسے دوسرے عالم سے آئی وہاں کے کان میں پڑی اور وہ دور دور نکل گیا۔ چلتے جیسوں کی آگ فٹنی ہو چلی تھی۔ ہاں کوئی کوئی ٹوٹی طباب اب تک کبھی تھی اور جہاں تھاں اٹھارے سرخ آتھوں کی مثال چھپتے تھے اور جب ہوا اٹھ کر صرا کی ریت کو دھکا دھکا ہوا آتھو کوئی دھوکا جیسے بھوکا اٹھنا اور فطلا کے گرد جانے پر پھر تھک کر چھٹ جاتا لے ہواؤں کا قافلہ کی طرف بے رات آگئی اور سب سو کر تاپہ ہو گئے اور بازو ہاں سکت ہو گئیں اور وہ فطلا جو اٹھوڑی اور زنجیر سمیت دشت میں بھوکے ہواؤں میں جسم بھوکہ کی مانند لڑتا ہے اور پچاسی زبان پر دھکا جاری ہے اسے سرے محمود اٹھیرے آتھوں کے تارے ڈوہ جاتے ہیں اور تیزی فطلوں کی آنکھیں بند میں ہیں اور فطلا میں نے اپنے روز سے بند کر لئے اور باہر چہرے سے دار کھڑے کر دیئے۔ جب اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو پچھلا کر دیکھا تھا۔ الا فطلا ہو چلا تھا اور فطلا کی آواز آئی۔ ایک ایک کلام نکل آ یا ہے اس نے اور گرد نظر دوڑائی۔ وہاں سے امام پاڑے کے اندھ چلا۔ اندھ غفلت کونوں میں رکھے ہوئے نہیں ایک

کیاں کیفیت کے ساتھ سن کر رہے تھے اور ان کے آس پاس پر دانوں کی ڈھیریاں بن گئی تھیں یہ پوچھنے کے قریب ایک شخص تنہا منتقل عزا خانے کی دیوار پر سر رکھے زار و قطار رو رہا تھا۔ گلیوں سے بار بار رز اٹھنے والے نسیم کو وہ غالی گھروں سے دیکھتا رہا پھر وہ پاؤں باہر نکل آیا۔

کیفیت اس کی جگہ تھی جیسے وہ جہ میں چلا ہوا۔ گلیوں کے اندر میرے اچالے میں سڑکیں مان دو چار ہیں سب چیزیں اسے بدلی نظر آ رہی تھیں۔ جیسے تھی جیسی اور نہیں ہیں۔ مسجد کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے گمان گزرا کہ ان لوگوں سے وہ اب نماز ہوا چاقی ہے۔ آج تو صوف بہت لمبی ہوئی کھل چکی مشکل ہے۔ اس نے تیزی سے قدم بڑھائے اور گلی سے مسجد میں داخل ہوا۔ مسجد غالی پڑی تھی۔ ہاں ایک شخص گلی صحن میں کھڑا اگلی اٹھائے آہستہ آہستہ کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہ بہت جہان ہوا۔ نماز ہو گئی یا اب ہو چکی؟ لوگ کہاں ہیں؟ ذہن پر زور ڈالنے کے بعد اسے یاد آیا کہ یہ شب عاشورہ ہے اور افعال پڑھنے والوں کو کربا میں ہونا چاہیے۔ مگر یہ کون کونسا تھا جو مسجد میں اکیلا افعال پڑھ رہا تھا۔ اس نے اس وقت جلدی میں اس شخص کو پہچانے کی کوشش کی نہیں کی تھی۔ بس اس کی پشت ہی دیکھ سکتا تھا۔

گلی سڑک روکا ایک اچالے میں آ گیا۔ گیس کی روشنی میں ایک خوبصورت پیکر ٹکڑا رہا تھا۔ اکیلے خوبصورت کے پاس رکھے ہوئے اگر وہاں کی بتیاں، کچھ نہ کچھ آدمی جو بی بی فاطمہ کی پرنکیوں تاشوں کی ڈھیری سے پرے بکھری ہوئی اکاڑا کھلیں۔ برابر میں بیٹا ہوا شخص دو چار سے چلنے لگتا سو رہا تھا۔ خوبصورت کو دیکھتا ہوا وہ آگے نکل گیا اور پھر اندر میرے میں چلنے لگا۔ اس لمبی گلی میں اندر میرا تھا دکا نہیں سب بندھیں۔ کسی کسی بندہ کان کی حق بات تھی جیسے فطرتی سے مل رہی ہو۔ چاند آسان پر نہیں تھا۔ آسمان کے اندر میرے میں بہت سے ستارے جھلکا رہے تھے دور دور چمکتے ہوئے بڑے بڑے ستارے گنڈھوتے چموتے ستارے جیسے کوئی سر پہن دوڑتا کھڑا ہو کر دکھائی دیا ہوا اس کے سوسوں سے لگی ہوئی چنگاریاں اندر میرے میں اڑتی رہ گئی ہیں۔ اسے یاد آیا کہ اسے بڑے اظہم لگتے لگتے تڑکا ہوا چاند تھا کہ اب اس کے بڑے اظہم پہلے نکل گیا یا عاشورہ کی شب لمبی ہو گئی ہے۔

اکھا موڑ مڑتے ہوئے اس کے کان میں میرے کی آواز آئی۔ اس عاشوقی میں یہ آواز اسے بہت جگہ لگی۔ ماتم مرید کرتے کرتے شہر بھر کا دھنکا خاموش ہو جاتا پھر اس خاموشی سے اظہم انگیز نوازی آوازوں کا اکھبرتا۔ شوار و خاموشی کے اس دور میں تج نے اس پر جب اثر کیا کہ اس کا پیچھے لگا پھر اسے بہت سے آہستہ آہستہ دھنکے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کالے پر رتے اوزھے لگی جو تھیں چپ چاپ اس کے برابر سے گزر کر ایک مکان میں داخل ہو گئیں جس کا دروازہ کھلا تھا اور اندر میرے پڑھا ہوا رہا تھا۔

جب رات عبادت میں بسر کی شوقین نے

اس آواز نے دور تک اس کا تعاقب کیا۔ پھر وہ موڑ موڑا اور اس لمبی کشادہ سڑک پر نکل آیا جہاں عمارتیں اکاڑا کھیں اور دور وہ راتوں کا سلسلہ دور تک چلا تھا۔ اسے اس وقت خیال آیا کہ وہ مگر جیسے چھوڑ آیا ہے اور کربا کے راستے پر جاتا ہے مگر کربا میں اس وقت افعال پڑھنے والے چند بڑھوں کے سوا کون ہوگا اور اس خیال سے اس کے قدم ہلچلنے پڑنے لگے۔

کربا کی طرف جاتے ہوئے سرے کا دوپل بھر یاد آ گیا۔ اس کے یاد آئے یہاں کو دھپان دور دور گیا۔ اسے اپنے بڑے لہا یاد آئے کہ اب منوں ملی کے نیچے دب پڑے تھے۔ شرب عاشورہ کو کس سوز سے یہ شرب پڑھا کرتے تھے پھر میرے اور نوے یاد آئے جو شخصیں کے ساتھ اس رات کو پڑھ جاتے تھے۔ دوسرے اور نوے اب کہاں بنے تھیں کہیں آئے؟ ان کے پڑھنے والے کہاں چلے گئے اور اس نے سوچا کہ اب شب عاشورہ کتنی خاموشی اور پران کی رتی ہے پلٹے پلٹے سرے کا دوپل بھر اس کے ذہن میں گونجنے لگا۔

جب رات عبادت میں بسر کی شوقین نے

پھر اسے اس رات کے اور میرے اور نوے یاد آ گئے۔ اس کے کان جیسے جیتے گئے۔ غلبہ بول آواز میں اور دھنک گنڈھوتے ہو کر ذہن میں گونجنے لگیں۔ لگا کہ وہ ان آوازوں میں بیٹا جا رہا ہے۔ اس کا عالم کچھ وہ چلا تھا جب رات کے عین بیگم میں ماتم کرتے کرتے اسے فطرت آ جاتا اور مدت اور سید پر چمکے ہوئے کیڑے کی جگہ کے ساتھ کانوں میں ماتم اور نوے کی مدھم آواز میں غلط سلاطین ہو کر اس عبادت میں جیسے وہ کسی دوسری دنیا میں پھنسی ہو کر نہیں سن رہا ہوا۔ اب ان آوازوں سے اک کا رونا و دھنک جھنجھتا رہا تھا۔ وہ ان آوازوں میں قہقہے لگاتا جا رہا تھا جیسے اس کی ذات انہیں آوازوں اور ان کے ارد گرد رہنے ہوئے مضمون اور کھیتوں کا مجموعہ ہو جیسے اس کی ذات آگ برساتی کھنکی کربا ہوا اور اس نے کربا میں قدم رکھتے ہوئے سوچا یہ سب بھی پر گزری ہے۔ بازو بھی میرے ہی رحم ہوئے ہیں۔ اور نہ پھر میں بھی مجھے ہی پہناتی تھی ہیں اور کربا سے دشمن تک پیدل بھی مجھے ہی چٹا ہے۔ اور کچھ دشت میں دوسرے کھوڑا تھا تاکہ اس کی ریزہ کی ہڈی بکھرنے لگی اور آکھوں کے لے باہر آنے لگے اور انھوں سے آراستہ پلک قریب ہوا کہ ہجر جائیں اور انھوں نے آگ لٹھڑی پڑ گئی۔ بیٹوں کی آگ لٹھڑی پڑ گئی اور نوئی ہوئی کتاب اور مرد مرید کھڑے ہوئے کا رونا ان کے لٹکانے شب اس نے مسجد سے سر اٹھا یا اور کھال کے صراہ پر غارتی رانوں پر پڑ گئی اور گیا کہ پاؤں اس کے دم کر گئے اور کھ سے لہو لہان ہو گئے اور پڑیا کر سی سے مل گئیں۔ ”دعا دہری ہے۔“ محمد عارف کی جلائی نے آہستہ سے اس کا بازو ہلا دیا۔ وہ بڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

دعا پڑھنے والوں کی مختصر سی صف کر جا کے ایک گوشے میں کھڑی تھی محمد عوض کر بلائی کے سر میں کچھ ناک کچھ نکلے بکھرے ہوئے تھے۔ خاک سب کے سروں میں تھی۔ اطفال حسین کے سر میں بھی مولوی فرزند علی کے سر میں بھی۔ مولوی فرزند علی کی نگاہت شہادت اٹھا میں بلندگی اور دوسرے ہاتھ میں کتاب تھی جس سے وہ عمر بی میں دعا پڑھتے جاتے تھے۔ وہ اٹھ کر دعا پڑھنے والوں کی صف میں شامل ہو گیا۔



مشکوک لوگ

”ختر ہے کہ میں میں سے نہیں ہوں۔“ ہاتھ تھمتے تھمتے اس نے سوچا اور اطمینان کا سانس لیا۔ ایک تو حسین تھا ایک عارف اور ایک وہ خود۔ پھر شفیق بھی آ گیا۔

”آؤ کئی شفیق؟“ عارف کہنے لگا۔ ”پار تو نظر نہیں آیا؟“

”میں وہاں پہنچا تھا مگر پھر میں پٹت آیا۔“

”کیوں؟“

”میں پٹت آیا۔ سب کہے ہوئے ہیں مالے۔“ شفیق کو بولتے بولتے فضا کھینچا۔ وہ چپ ہوا۔ پھر ہرے کو آواز دی۔ ”بھرا“ شریف نے دور سے شفیق کو دیکھا۔ آیا یا لا۔۔۔۔۔ ”ہاں مئی شفیق صاحب مئی اکھا؟“ ”پہلے پانی پلا یا ز“ شفیق نے بھاری کے لہجے میں کہا۔ پھر عارف سے مخاطب ہوا۔

”کون تھا؟“

”سب ہی تھے“ عارف کہنے لگا۔ ”فضل تھا۔ اشتیاق تھا۔۔۔“

”اشتیاق؟“ شفیق بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”اے میں نے دیکھا تھا۔ فراد؟“ اس کی آواز فطیعی ہو گئی۔

حسین اشتیاق کی حمایت میں کہنے لگا۔ ”وہ سب آگے تھا۔“

شفیق نے حسین کو ال ال پہلی نظروں سے دیکھا اور گرما کر بولا۔ ”ایسے لوگ سب آگے ہی ہوا کرتے ہیں۔“

”کیسے لوگ؟“ حسین نے جمل کر سوال کیا۔

”تم اشتیاقی کوٹیں جانتے؟“ شفیق نے سوال کے جواب میں سوال کیا۔

”چھ نہیں تمہارا کس طرف اشارہ ہے؟“ حسین بولا۔

”میرا جس طرف اشارہ ہے وہ تم ابھی نہیں جگھے ہو تو جلدی کھھاؤ گے خیر ایہ بتاؤ کوئی کڑ تو نہیں ہوئی؟“

"مگر کل تو وہ بہت غرے لگا رہا تھا" فطیل بولا۔

"ایسے لوگ غرے بہت لگاتے ہیں۔"

"عارف صاحب آپ کا فون ہے۔" کاؤنٹر سے آواز آئی۔

عارف پک کر کاؤنٹر پر گیا۔ فون پر کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ پھر وہاں سے واپس آیا۔ کہنے لگا۔ "یار میں جا رہا ہوں۔"

"چائے بنا رہی ہے؟" فطیل بولا۔

میرے بدلے کی فطیل پینے لگا۔ میرا فون آگیا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔"

عارف چلا گیا۔ فطیل خاموشی سے کھانا کھا رہا۔ پھر کھاتے کھاتے بولا۔

"یار عارف کے فون کچھ نہ بڑا دبی آتے ہیں اور کبھی چاند نہ چلا کر کہاں سے آتے ہیں۔ فون چاند تو بت لی ٹھنک کر رہا ہے یا پھر
ویرانہ دیکھ لیا۔ بات کی اور فوراً چلا گیا۔"

"ہاں آدھی خامسا پر اسرار ہے! فطیل نے ٹکڑا لگا لیا۔"

خالی پیٹ میں چائے کی بدبو کی ایک اجیری بن گئی تھی اور فطیل اچھی خاصی باتیں کر چکا تھا۔ پھر چائے آگئی۔ وہ چائے بنانے
لگا۔ فطیل اٹھ کر باہر دم کی طرف چلا گیا۔ فطیل نے چائے بناتے بناتے سادگی سے پوچھا۔ "یار صاحب فطیل تیرا دوست ہے؟" فطیل نے
کہہ دیا۔

"فری لانسنگ"

"فری لانسنگ! کون کہتا ہے؟"

خود فطیل کہہ رہا تھا کہ آج کل فری لانسنگ کر رہا ہوں۔"

"کچھ کرتا ہے۔"

فطیل چپ ہو گیا۔ چائے بنانے لگا۔ پھر پوچھنے لگا۔ "اگر فری لانسنگ کرتا ہے تو کسی ایڈیٹر میں اس کا کوئی ٹیچر کا نام آتا چاہیے۔ تاہم
کس ایڈیٹر میں آتا ہے؟"

اس سوال پر اس نے کچھ سوچا۔ پھر گھبرا کر کہا۔ "یار پتہ نہیں!"

فطیل جب اس سے براہ راست سوال جواب کرنے لگا تو وہ بالعموم گھبرا جاتا۔ کسی کی بات ہوتی مگر اسے یوں لگتا کہ وہ مجرم ہے

اور فطیل کے درپردہ کھبرے میں کھڑا ہے۔ مگر پھر فطیل نے خودی پیلو بدلا۔ "اور اگر فری لانسنگ بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے۔ جو ایڈیٹر میں
باقاعدہ کام کرتے ہیں انہیں بھی میں جانتا ہوں سب سالے کیے ہوئے ہیں۔"

فطیل باقاعدہ دم سے واپس آگیا۔ چائے اب بن گئی تھی۔ فطیل نے ایک پیالی فطیل کی طرف دوسری پیالی اس کی طرف تیسری
پیالی خود اپنی طرف سرکائی۔ فطیل پیالی کو سیڑی اپنی طرف سرکاتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "ہاں کیا کہہ رہے تھے؟"

"میں اپنے ملک کی صحافت کی بات کر رہا تھا۔"

"حکومت کی چھو کر سمجھائی کیا کر رہے ہیں۔" فطیل نے ٹھنڈا سا سانس بھرا اور چائے پینے لگا پھر کہنے لگا۔ "میں تو سوچ رہا ہوں کہ یہ
پیشہ چھوڑ دیں۔ بہت ڈنکلی پیشہ ہو گیا ہے۔"

"پھر کیا کرو گے؟"

"وکالت" چپ ہوا۔ پھر اس سے مخاطب ہوا۔ "صاحب اشتیاق کی وکالت کیسی جا رہی ہے؟"

"بڑی توشا نہیں جا رہی۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"بہت اچھی جا رہی ہے" فطیل اپنے منہ پر یہ لہجہ میں بولا۔

"ہاں بھئی! انہی لوگوں کا زمانہ ہے" فطیل نے پھر ٹھنڈا سا سانس بھرا۔

"پتہ ہے کس کے لئے مقدمے لیتا ہے؟" فطیل نے زبردست لہجہ میں کہا۔

"پتہ ہے" فطیل ایسے ہنسنا جیسے وہ دروڑوں پر دروازوں سے واقف ہے۔ فطیل فطیل کے اس ردعمل پر خامسا مطمئن تھا۔ خاموشی

سے چائے پینے لگا۔ مگر پھر چائے پیتے پیتے پوچھنے لگا۔ "تو عارف بھی قاتل؟"

"ہاں" فطیل بولا۔

"اس نے بھی خوب غرے لگائے؟"

"غرے دارے اس نے نہیں لگائے بس ساتھ تھا۔"

فطیل کے ہاتھوں پر ایک مٹی خیر مسکراہٹ نکلی۔ "کھانا آدھی ہے؟" پھر فطیل نے جلدی جلدی چائے پی۔ جس سے کو آواز دے
کے مل رہا تھا۔

"بس؟" فطیل اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں یارا آخر میں کرنے کے لئے بہت کام پڑا ہے۔"

"راست میں دلخیز؟"

"ہاں آن سینے کی آخری تاریخ ہے۔ حساب کلوز ہو رہا ہے۔ اور وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

شفیق کے جانے کے بعد میز پر عجیب خاموشی چھا گئی۔ اب طفیل تھا اور وہ تھا۔ دونوں تھوڑی دیر بیٹھے رہے ہاتھیں کرتیں رہے پھر بور ہو گئے۔

"یار طفیل اب اطفیل بولا۔ اور دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس لمبی سڑک پر وہ دھور طفیل دیر تک چلتے رہے جیسے چانے کی میز کی گھٹکوں سے تھک گئے ہوں اور اب چپ رہنا چاہتے ہوں۔ وہ چانے کی میز کی گھٹکوں سے بے کیف تھک گیا تھا مگر اس گھٹکوں نے اس کا بیچ نہیں چھوڑا تھا۔ شفیق کے شک بھرے اعلانات اسے ایک دیک کر کے یاد رہے تھے۔ "یار طفیل" وہ چلتے چلتے پھر بولا۔ شفیق اشتیاق کے بارے میں بہت شک کا اظہار کر رہا تھا۔ ظاہر میں تو وہ اپنا نظر نہیں آتا تھا۔ ادا کیا کیا ہے؟"

"ظاہر میں تو یار سب ہی اچھے نظر آتے ہیں۔" طفیل رکا۔ پھر بولا۔ "ظاہر کی سنو اقم نے کافی ہاؤس میں ایک آدمی کو دیکھا ہوگا جو وہاں صبح دوپہر شام ہر وقت چلتا رہتا تھا اور سب کے ہاتھ دیکھ کر کہتا تھا۔"

"ہاں دیکھا ہے بلکہ اسے ہاتھ بھی دکھایا ہے۔"

طفیل ہنسا۔ "اچھا تو تم بھی اسے ہاتھ دکھا چکے ہو؟"

"ہاں یارا مجھے تو اس نے ماضی کی سب باتیں ایک بتا گئیں۔"

طفیل ہنسنے لگا۔ "ماضی کی باتیں تو وہ سب ہی کو فلیک بتاتا تھا سب ہی کا ماضی اس کی اچھیں پر تھا۔"

"میرے ہاتھ کا وہ بہت معترف تھا۔"

"اچھا"

"ہاں کہتا تھا کہ ایسا ہاتھ میں نے نہیں دیکھا۔ اس نے میرے ہاتھ کا کس بھی لیا تھا۔"

"کیا؟" طفیل چلتے چلتے ایک دم سے رک گیا۔ "تم نے اسے ہاتھ کا کس دے دیا؟"

"ہاں پھر؟" وہ ہنسنے لگا۔

طفیل حیرت سے بولا۔ "تو تم اسے کچھ پاست کھتے تھے؟"

وہ کچھ بولکھٹا سا گیا۔ "پھر کون تھا وہ؟"

"صابر تم نے گاؤڑی ہوا؟" طفیل نے کچھ سے بے لوث میں کہا اور پھر بٹنے لگا۔ طفیل نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ مگر سوال اس کا تھا تب کرتا ہوا اچل رہا تھا۔ پھر کون تھا وہ؟ پاست نہیں تھا۔ میں تو اسے جی بھکتا تھا۔ سب سی اسے ایسا کھتے تھے اور اپنا پتا ہاتھ دکھاتے تھے۔ میں نے بھی ہاتھ دکھا دیا۔ طفیل کھنکھناتا رہا۔ ہاتھ دیکھنا تو وہ جانتا تھا۔ مجھے ایک بات اس نے سمجھائی تھی۔ میرے ہاتھ کا بہت معترف تھا۔ جی تو اس نے اس اہتمام سے میرے ہاتھ کا کس لیا تھا کہ..... وہ صدمہ کیا۔

"یار طفیل ادھر آدمی آن کل نظر نہیں آ رہا کہاں ہے؟"

طفیل ہنسا۔ "تم نے اسے ہاتھ کا کس دیا ہے۔ جیسے پتہ ہوگا؟"

"ہاتھ کا کس لینے کے بعد ایک دو گھر تو نظر آتا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ کس نے مٹا کر لیا ہے جیسے بتاؤں گا۔ پھر وہ غائب ہی سا ہو گیا۔" اور کہتے کہتے وہ سو فی میں چڑ گیا کہ آخروہ شخص کیا کہاں۔ پھر اسے اپنے ہاتھ کا کس کا دھیان آیا اور اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھنے لگا۔

"وہ آئے آن کل ایک سے صاحب تمہاری میز پر مستقل نظر آتے ہیں۔" طفیل کہنے لگا۔

"میں تو انہیں جانتا نہیں۔ کون صاحب ہیں یہ؟"

"اچھا وہ جس نے فریج کنٹ رکھ چھوڑی ہے اب بہت معقول گھٹک کرتا ہے۔"

"کرنا ہوگا مگر ہے کون؟ عدوارہ پر کیا ہے ان صاحب کا؟"

"یار تو میں نہیں جانتا۔"

طفیل کی اس بات پر اس کا لہجہ کی قدر معذرت ہو گیا۔ "یاد رہے وہ تھام کا ذکر آ گیا تھا اس لئے بات ذرا لمبی ہو گئی۔ ویسے میں ان صاحب کو مطلع نہیں جانتا۔ اصل میں یہ صاحب عارف کے حوالے سے انکاری میز پر آتے ہیں۔"

"پھر ایک ہے۔" طفیل ہنسنے لگا۔

"یار طفیل تم تو دوسرے شفیق بنا گئے ہو۔ ہر ایک چٹک کرتے ہو؟"

"شفیق کا شک ابیشہ ہے بنیا نہیں ہوتا۔" طفیل رکا۔ پھر بولا۔ "جیسے یاد ہے کہ عارف کے ساتھ ایک زمانے میں ایک گوری

پلاڑی والا آیا کرتا تھا اور عارف کہا تھا کہ میرا دوست ہے۔ کیڑیہ اسے آیا ہے اور اسٹنی امریکن ہے جنگ چھڑی تو وہ بندہ ایک دم سے غائب ہو گیا۔ وہ اصل میں ۵ جبر کو یہاں سے چلا گیا تھا اور وہ کیڑیہ کا نہیں تھا۔

”پھر کون تھا وہ؟“

”کون تھا وہ؟“ طفیل نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”شفیق سے پہچانو وہ بتانے کا نہیں۔“

شفیق کے حوالے پر اب اس سے ہاتھ کیا۔ بولا۔ ”شفیق تو تمہارے بارے میں بہت کچھ کہتا ہے۔“

”میرے بارے میں“ طفیل صرغٹ گیا۔ ”میرے بارے میں کیا کہتا ہے؟“

”اس تمہاری آمدنی کے ذرائع کے بارے میں شک کرتا ہے۔“

طفیل کی قدر قابل سے ہنسا۔ پھر اپنی پروائی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ ”آدی کے اپنے ذرائع آمدنی مشکوک ہوں تو اسے دوسرے کے ذرائع آمدنی ٹھانڈا ٹھانڈا مشکوک نظر آتے ہیں۔“

طفیل کے رد عمل پر اس کی کئی جھڑکی طفیل کے ساتھ بھائی ہوئی اور شفیق کے بارے میں اس کا اپنا رد عمل نمودار کیا۔ ”یار شفیق جب ہے سب ہی کے بارے میں شک کرتا ہے۔“

”تا کہ خود اس کے بارے میں کوئی شک نہ کرے۔“ طفیل نے مختصر اکہ اور خاموش ہو گیا۔

دونوں خاموش چلتے رہے۔ پھر طفیل نے جبر چھڑی لی۔ ”یار صابر! تم وہاں کیا کر کے گئے تھے؟“

”میں کہاں؟“ وہ پکرا گیا۔

”اچھا! وہ ہنسا۔“ میں لاہوری کی کیا تھا۔ ان امریکیوں کی لاہوری سے استفادے میں بھی مضائقہ ہے؟ کیا کہہ رہا تھا شفیق؟“

”وہ جبر کے بارے میں کیا کہتا ہے؟“

وہ پھر فیس پڑا۔

دونوں پھر خاموش چلتے گئے۔ چلتے چلتے طفیل بولا۔ ”شفیق سے ذرا احتیاط رکھو۔“

”کیوں؟“ وہ چونکا۔

”بس میں نے کہہ دیا ہے۔“ طفیل نے معنی فیر لیے۔

اب اس کی گل کا موز آ گیا تھا۔ ”اچھا! صابر! گل بیس کے؟“

طفیل اپنی گلی میں سڑ گیا۔ اب وہ کیا تھا اور آزدی سے اپنے خیالات میں گمن جاں کیا تھا۔ چلتے چلتے اسے ایک مرتب پھر اشتیاق کا خیال آیا۔ بات کچھ کچھ میں نہیں آئی۔ اشتیاق اس قماش کا آدمی تو نہیں ہے۔ میں بھی اسے اتنے عرصے سے جانتا ہوں اور آدمی آخر تک اپنے آپ کو چھپا سکتا ہے۔ مگر شفیق کہتا ہے۔ غیر شفیق تو سب ہی کے بارے میں کہتا ہے۔ حسین کے بارے میں بھی عارف کے بارے میں بھی طفیل کے بارے میں بھی تو کو یا سب ہی کا دشمن آلودہ ہے۔ حد ہو گئی۔ اور خود شفیق؟ شفیق اشتیاق کے بارے میں کہتا ہے اور اشتیاق شفیق کے بارے میں کہتا ہے۔ ”یار صابر! اشتیاق چو چور ہوا۔“ شفیق کی ٹھوکان کیا ہو گی؟ ”چند بیس پاز“ ”قیاس تو کر سکتے ہو کہ کتنی ہو گی! یار میرے نے گھبرگ میں زمین خریدی ہے۔“ ”گھبرگ میں؟ نہیں یار۔“ ”اچھا! ہاں۔“ تو اشتیاق شفیق کے بارے میں کہتا ہے اور شفیق اشتیاق کے بارے میں کہتا ہے اور طفیل دونوں کے بارے میں کہتا ہے۔ ”شفیق اشتیاق طفیل حسین عارف کو یا سب کہہ کر تو اس نے آپ کو بھی شامل کر لیا تھا۔ اس وقت اس نے ایک مرتب پھر اپنے کردار کا غیر جانب دارانہ محاسبہ کیا اور اپنے آپ کو سب برائیوں سے بری پایا۔ جو جن میں سے ہے ان کے اٹھایا جائے گا۔ فکر ہے کہ میں اس میں سے نہیں ہوں۔ اس نے اک احساس برتری کے ساتھ اطمینان کا سانس لیا۔ مگر پھر اسے طفیل کی کئی ہوئی بات یاد آگئی۔ شفیق میں بارے میں کیا کہتا ہے پھر بتا ہے۔ خیر! ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں وہی ہوں جو میں ہوں۔ اس نے بے اشتیاقی سے سچا اور شفیق کی بات کر کر دیا۔ مگر چلتے چلتے پھر اسے اس بات کا خیال آ گیا۔

آخر اس نے انہی کہا کیوں؟ اور اسے قصداً بتا دیا۔ اصل میں وہ ان میں شمار نہیں ہونا چاہتا تھا جن میں سے وہ نہیں تھا اور اس نے طے کیا کہ کتنا کہ سدا ب نورا ہونا چاہیے۔ میں اشتیاق تو نہیں کر آؤ گا کی کہ جاؤں۔ آؤ گا کی وہ کرے جس کے اندر کھوت ہو۔ اور وہ چلتے چلتے چلا۔

اب رات تھی اور سڑک پر اچھا لگی تھا اور اندھ جبر ابھی تھا۔ وہ چل گیا رہا تھا دھڑ دھڑا ہوا۔ بہت آگے جا کر وہ وہاں ہوا تھا۔ پھر بھی وہ جلدی آ بیچا اور حیر کے موافق اندر داخل ہوا۔

”شریف! شفیق آئے تھے؟“

”آئے تھے نہایت دیر پیچھے۔ ابھی ابھی گئے ہیں!“

اسے صحت افسوس ہوا۔ ذرا دیر پہلے آ جاتا تو اسے بکا لیتا۔ طفیل کی جھڑپاٹنے لپٹی چاہیے تھی۔ پھر وہ اندھ کھڑا ہوا۔ چائے کا

آرڈر منسوخ کیا اور بار نکل گیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ کل بیٹوں کا۔ اچھا ہے اس دوران طفیل سے تحصیل بھی معلوم ہو جائے گی۔ اس وقت بھی تو اس نے ادنیٰ سی ایک بات کہی تھی۔ میں نے بھی زیادہ دھیان نہیں دیا۔ پہلے پوری بات معلوم کر لینی چاہیے۔

ویسے ابھی کوئی زیادہ رات ہوئی ہے اور طفیل سویرے سوئے والوں میں تو نہیں ہے۔ ایک لہرائی اور اس کے قدم طفیل کے گھر کی طرف اٹھ گئے۔ گیت کمال تک جھپک دھل ہوا۔ جی صرف برآمدے میں مل رہی تھی۔ لان میں اندھیرا تھا۔ قاضی صاحب کی محفل آج زیادہ لمبی چوڑی نہیں جس روز کے آنے میں صرف مرزا صاحب تھے۔ باقی ایک صاحب اور بیٹھے تھے جو اس کے لئے ابھنی تھے۔ قاضی صاحب ہاتھیں کرتے کرتے رکے۔ "صاحب! ڈبھی۔ طفیل ابھی نہیں تھا۔ کوئی آئے تو بلواتا ہوں۔ بیٹھو!"

خاک پڑی ہوئی کرسیاں میں سے ایک کرسی پر وہ بیٹھ گیا۔ قاضی صاحب نے ٹھٹھک کا نوحا ہوا سلسلہ بھر جڑا۔ "تو صاحب روز رات کو جب بارہ کامل ہوتا تو وہ آدی آتا رو پیچ پھٹکتا اور مضانی کا کورا لے جاتا۔"

ابھنی آدی اپنی کرسی پر کسمایا۔ "مضانی کا کورا آکا ایک روپے میں؟"

قاضی صاحب ہنسے۔ "ارے بھائی یہ تمہارے زمانے کی بات نہیں ہے۔ ہمارے زمانے کا ذکر ہے۔ مرزا صاحب ڈراپٹا ڈانٹیں اس زمانے میں گیہوں میں بھاڑ تھا۔"

"بھائی کی بات تو یہ ہے" مرزا صاحب ہلکے کی "نہ" منہ سے الگ کرتے ہوئے بولے۔ "کہ ایک روپے میں میں گیہوں سے پوری بھر جاتی تھی۔"

"صاحب ہم تو یہ جانتے ہیں" قاضی صاحب بولے۔ "کہ ایک روپے کے گیہوں کے لیے ہم حدودی کیا کرتے تھے اب تمہارے ایک روپے کا گیہوں خدا جھوٹ نہ بوائے غمی میں آ جاتا ہے۔"

مرزا صاحب نے لحظہ اسانس بھرا۔ "قاضی صاحب پیسے کی قیمت نہیں دے رہی؟"

"مرزا صاحب" پیسے کی قیمت تو آدی سے ہوتی ہے۔ "اب آدی ہی کی کوئی قیمت نہ گئی ہے۔"

"آدی" مرزا صاحب نے بھر لحظہ اسانس بھرا۔ "آدی تو مولیٰ کا جڑیں گئے؟"

قاضی صاحب خاموش حق پتے گئے۔ مرزا صاحب نے آنکھیں بند کر لیں اور جیپوں میں کھو گئے۔ ابھنی آدی کرسی میں بھر کسمایا۔ "صاحب وہ تھوڑے سی میں رو گیا؟"

قاضی صاحب نے ہلکے کی "نہ" ایک طرف کی۔ "صاحب کچھ تو ان دنوں مضانی سستی تھی اور کچھ شاید اس روپے کی تاخیر تھی"

کہ مضانی کچھ زیادہ جمل جاتی تھی۔ بس یہ کچھ لو کہ ادھر آدی کو کرا کے کر رخصت ہوا اور یوں گنگا کہ دکان میں چھانڈا دل گئی۔ رحیم بخش طوٹا کی کچھ میں کچھ آئے کہ بات چاہے۔ مگر مولانا کھڑا بہت پہنچا ہوا تھا۔ وہ تازہ گیا۔ بولا کہ رحیم بخش تیری دکان پہنچاں گلاں آدی آدے بنے جیسے گئے ہے کہ وہ آدی نہیں ہے۔ رحیم بخش نے پوچھا کہ ابے تو نے کیسے جانا۔ مولانا بولا کہ میں نے اس کی پتلی دیکھی ہے۔ وہ بھرتی نہیں۔ رحیم بخش چپ برہا۔ مگر جب رات کے بارہ بجے اور وہ آدی آیا تو رحیم بخش نے مضانی تو لے لے تو لے اس کی پتلی پانچر داری۔ بالکل ساکت۔ رحیم بخش کے غی میں کیا آئی۔ پوچھ بیٹھا کہ سیٹھ تمہارا نام کیا ہے۔ یہ پوچھنا تھا کہ تیرا شاہ سے ایک قبچر پڑا اور آدی قاسب۔"

"آدی قاسب؟" ابھنی نے قاسب سے پوچھا۔

"ہاں چاروہ نظر نہیں آیا۔ بھرنے پر چھو کہ شہر میں کیسا براںں بچایا۔ آدی آدی سے خوف کمانے لگا۔۔۔ ہر کوئی کسی پر شک کرتا اور نام پر پھنسے سے کھراتا۔"

مرزا صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ بھر بولے۔ "رات کے وقت کسی سے نام نہیں پوچھنا چاہیے۔"

"صاحب میں تو دن میں بھی نہیں پوچھتا۔ کیا پتہ کون آدی اندر سے کیا لگے۔ ہاں پتلی ضرور دیکھ لیتا ہوں۔"

مرزا صاحب بولے۔ "آدی کو پچھانے کا طریقہ یہ ہے کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔ کوئی اور لائق ہے تو کبھی آنکھ نہیں ملے گی۔"

"خطرہ تک کھیل ہے" قاضی صاحب آہستہ سے بولے۔

"ہاں خطرہ تک تو ہے۔"

بھر قاضی صاحب اور مرزا دونوں کچھ چپ سے ہو گئے۔ قاضی صاحب نے ہلکے کے چند گھومتے۔ بھر خاموشی سے مرزا صاحب کی طرف موز دی۔ مرزا صاحب نے کھوئے کھوئے انداز میں "نہ" بھونوں میں وہابی اور کھونٹ بھرنے لگے۔ سامنے برآمدے کی دھندلی روشنی میں ایک سایہ حرکت کا نظر آیا۔ قاضی صاحب نے آواز دی۔ "مضانی طفیل کو کبھی۔"

"خفیل میاں سو گئے ہوں گی؟"

"میاں آدو تو گیا" قاضی صاحب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

مرزا صاحب حق پتے پتے پو گئے۔ "رات ابھی غامی ہو گئی ہے۔ اب چلنا چاہیے۔"

محرر صاحب کے اٹھنے سے پہلے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ قاضی صاحب کو سلام کیا اور بڑھل آیا۔

طفیل کے کمرے سے نکل کر وہ اپنے کمرے کی طرف ہوا۔ رات ابھی خاصی ہوئی تھی۔ آدھ رات کم و بیش بندھی کبھی کوئی رکشا کبھی کوئی چلیسی اک شور کے ساتھ گزری پہلی جاتی اور پھر دوسری خاموشی۔ سناں سڑک پر چلتے چلتے سامنے سے ایک شخص آنا نظر آیا۔ قریب آتا گیا پھر بالکل قریب اسے دیکھتا گزر چلا گیا۔ کون فطس تھا؟ بہت غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنکھیں اداں کر خیال آیا کہ سڑک پر کچھ گھبراہٹ رہی اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ یہ کوئی گناہ تھا؟ اس سے کوئی باتیں ہاؤس کے پاس تھا خیال آ گیا۔ سارے سارے دن کافی ہاؤس میں بیٹھا رہتا کبھی اس سیز پر کبھی خریدی آرت پر بہت کبھی سیاسی صورت حال پر گفتگو پھر ہاتھ دیکھتے لگتا اور سب اپنا اپنا ہاتھ دکھاتے۔ قاضی کی صحیح تھکات جان کر حیران ہوتے اور مستقبل کے بارے میں سوال کرتے۔

مگر طفیل کہتا ہے کہ وہ پاس تھا ہی نہیں۔ کمال ہے۔ میرے کچھ بتا دیتا تھا اور اگر پاس نہیں تھا تو پھر کون تھا؟..... کون تھا؟

اور میرے ہاتھ کا کس؟ اسے کچھ دیکھ سونے لگا۔ مگر پھر فرار اس نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ میں تو طفیل بنا جا رہا ہوں۔ حد ہے طفیل سے حسین عارف۔ طفیل سب پر شک کرتا ہے۔ اور اشتیاقی، طفیل پر شک کرتا ہے۔ طفیل اشتیاقی اور طفیل دونوں پر شک کرتا ہے۔ کمال لوگ ہیں۔ بروکری پر شک کرتا ہے۔ آدی آدی سے خوف کھانے لگا۔ وہ فطس کا۔ یہ تو قاضی صاحب کہہ رہے تھے۔ قاضی صاحب بھی خوب بزرگ ہیں۔ دنیا کا کوئی ذکر ہو۔ جو اس کا ذکر وہ سناں میں ضرور لے آتے ہیں۔ آخر انہوں نے زندگی میں کتنے جنم دیکھے ہیں۔ کیا اس زمانے میں سب جنم بہت تھے؟ ہم انہوں میں زمانے میں جنم بہت تو نہیں ہوتے۔ ہوتے تو ہیں آدی ہی۔ مگر طفیل..... طفیل تو خیر خود..... طفیل اگر قاضی صاحب کے زمانے میں ہوتا تو قاضی صاحب ہوتا۔ سب کی چل دیکا کرتا۔ حد ہے کہ میرے میں بھی..... بس حد ہی ہوگئی۔ اب وہ مجھے نہیں فطس تھا۔ مگر اسے طفیل کی بات پر رد و رد کرتا ہوا۔ اور اس کی قدر مثال میں اتنا لگا تھلک رہا ہوں اور میرے بارے میں بھی۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے اپنے خیر جاندا ارادہ روئے بحال کیا اور سوچنے لگا کہ آخر طفیل کو شک کیسے پڑا۔ اس نے اپنی کئی بھولی بھری نظروں کو یاد کیا۔ مگر ہر نظر اس کا اس کے پاس جڑا تھا۔ یوں بھی یہ کوئی بڑی نظر تھی۔ دوسرے جو کر رہے ہیں ان کے مقابلے میں تو یہ باتیں کئی حیثیتیں نہیں رکھیں۔ باقی کہنے والوں کا کیا ہے۔ اور میں فرشتہ تو ہوں نہیں۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے حق میں قرار دیا اور اداں دکھادی اور مطمئن چلنے لگا۔

سڑک سناں تھی۔ کوئی کوئی رکشا شور کرتی تھی سے قریب سے گزر جاتی اور خاموشی پھر روٹی ہو جاتی۔ بہت رات ہوگئی۔ اور

آٹا بے سو رہا۔ آخر آتی گجٹ کی ضرورت کیا تھی۔ کل طفیل کو ملتا ہی ہے اور طفیل کو بھی۔ ہاتھ کے ہاتھ دو دو کا دو دو پانی کا پانی ہو جائے گا۔ چلتے چلتے وہ ٹھٹھ سا گیا۔ اب وہ سونو والی کھچی کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ یہیں قدر سے اُسے میرا قہار اور کھچی کا کتا خاموش کھڑا اسے شک کی نظروں سے محروم رہا تھا۔ اس نے اپنی چال میں فرق نہیں آنے دیا۔ اداں کا اعلان کرتی آہستہ چال کے ساتھ سامنے سے گزر چلا گیا۔ گزرتے گزرتے ایک نظر کچھ پڑا لی۔ اسے لگا کہ اس کی آنکھیں شیشے کی ہیں تو کسے کی چل بھی کر دی نہیں کرتی پھر اسے جو کسی اس آدی کا خیال آ گیا کہ جراحی تھوڑی دیر پہلے اس کے قریب سے اسے غور سے دیکھتے ہوئے گزر رہا تھا۔ عجیب بات ہے کہ دن میں کوئی کسی کی طرف نہیں دیکھتا۔ رات میں بروکری پر کسی کو شک بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔ کون تھا وہ؟ کون؟ اس کے دھیان نے پٹری بدلی اور کافی ہاؤس میں چلا گیا۔ اگر وہ پاس نہیں تھا تو پھر کون تھا؟..... اور میرے ہاتھ کا کس..... اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ کراس نے فوراً ہی جرح جرحی لی۔ میں تو بالکل قاضی صاحب ہوتا جا رہا ہوں۔ قاضی صاحب کے خیال سے اسے عجیب سا خیال آیا۔ اشتیاقی، طفیل، حسین عارف، طفیل کو ایک ایک کر کے وہ دھیان میں لائے۔ انہیں اور ان کی جگہوں کو۔ کیا ان کی چلتیاں..... اس نے پھر جرح جرحی لی۔ میں تو بالکل طفیل بنا جا رہا ہوں۔ اور اس نے لیے لیے ڈاک بھرنے شروع کر دیے۔

مگر کھچی کراس نے اطمینان کا سانس لیا۔ آج اسے یہ مختصری مسافت کتنی طویل نظر آتی تھی کمرے میں جا کر اس نے نکل جہانی۔ کمرے کی ہریج فریٹ سے کبھی قہقہہ شاید آج اس جی سے کمرے کی صفائی کر لی ہے۔ کراس پر رکھا ہوا بڑا سا آئینہ جو کتب تک مٹا ملا تھا کتا چمک رہا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کتا کھوتے کھوتے بے دھیانی سے اپنا چہرہ غور سے دیکھنے لگا۔ ہاتھ پڑا ہوا چلتیاں۔ مگر پھر اسے نورادھیان آ گیا۔ وہ آئینے کے سامنے سے ہٹا۔ کپڑے بدلے اور کرسی پر ٹانگیں اٹھا کر بیٹھ گیا۔ اس طرح وہ بیٹھ کر سوتا یا کرتا تھا۔ پاس کی پردائی عادت تھی۔

بیٹھے بیٹھے اس کا دھیان بے غور ہو چکا تھا۔ قاضی صاحب خوب بزرگ ہیں۔ انہوں کی چلتیاں دیکھتے ہیں۔ طفیل کی چل بھی دیکھی ہو کی۔ اس تصور سے وہ جڑا اسکا رہا۔ مگر دھیان پھر کی اور دست میں نکل گیا اور وہ بڑکا بڑکا چلنے لگا۔ میرے ہاتھ کا کس..... کون تھا وہ آدی؟ قاضی صاحب، طفیل..... جب گیٹ میں داخل ہو کر میں نے ان میں قدم رکھا تھا تو قاضی صاحب نے مجھے کیسے دیکھا تھا..... ویسے تو نہیں دیکھا تھا جیسے اس آدی نے..... مگر کیا خبر..... اور اسے لگا کہ اس کے ہاتھ کا کس کھیل گیا ہے اور ساری کھیریں

طفیل اشتیاقی، طفیل سب پر عیاں ہوگئی ہیں۔ وہ بڑا بڑا کتا کھڑا ہوا۔

اس نے انگڑائی لیتے ہوئے سارے دھوسوں اور اندھنیوں کو نکھر چمکا اور سوچا کہ رات جہاری ہے اب سوتا چاہیے۔

وہ طے تھن محسوس کر رہا تھا۔ سوچ سوچ کر بھی آدھی کتا تھک جاتا ہے۔ سوچا کہ سونے سے پہلے منہ دھو کر صحن اترے اور صحن کی نیند آئے۔ یہ سوچ کر وہ ہاتھ کی طرف ہولیا۔ منہ دھوے دھوے اس نے توجہ کرتے ہوئے سوچا کہ کیا اشتیاق واقعی... مگر اشتیاق شیلی کے بارے میں بھی کہتا ہے۔ اور شیلی تو سب ہی کے بارے میں کہتا ہے عجیب مضحکہ خیز صورت حال ہے۔ وہ بیس پڑا مگر جب وہ ہاتھ روم سے نکل کر تو لیٹے منہ پر چھو رہا تھا تو اس کی فسی رخصت ہو چکی تھی۔ اس نے تھکے ہوئے انداز میں سوچا کہ شاید ہم سب ہی مشکوک حالات میں نعل حرکت کر رہے ہیں۔ اشتیاق "مضیق حسین عارف اور شاہ شیلی بھی اور شاہ شیلی میں..... مگر وہ روایتی طعنے کیا جیسے قدم اٹھ گیا مگر سامنے کھائی دیکھ کر اٹھ کا اٹھارہ ہو گیا اور آدھی ایک ٹانگ پر برقرار رہنے کی کوشش کر رہا ہو۔

منہ پر چھپتے ہو چھپتے ہو رک گیا تھا مگر پھر وہ دوسروں کی دنیا سے واپس آ گیا۔ سب دایموں اور دوسروں کو وضع کر کے اطمینان سے منہ پر چھپا "سر پر چھپا" پھر تو لیٹ کر سی پڑا "اٹھ" اٹھ کیوں سے طعنے سے ہاتھوں کو ستوارنے لگا۔ ہاتھوں کو بے ستوارتے وہ کانٹوں کی طرف بڑھا۔ آئینہ دیکھنے لگا تھا کہ رک گیا۔ سوچا اور پھر آئینہ الٹ کر رکھ دیا۔ پھر کچل گئی اور بستر پر لیٹتے ہوئے طے کیا کہ شیلی قاتل ہونے سے رہا تو کیوں وضاحت اور صفائی کی کوشش کی جائے۔ پھر اس نے کراہت بلی اور سو گیا۔



شرم المحرم

"سرس مصلیٰ قاتل قہار کھر کہاں تھا؟"

مصلیٰ قاتل نے سامنے بیڑ پر پڑے ہوئے تھکے ہوئے سر کا پانچواں انگلی رکھ کر کہا "میرا کھر اس جگہ ہے۔"

"یہ تو سرحد پر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ قہار کھر تو کیا۔"

مصلیٰ قاتل رکا۔ پھر رات چپا کا ہوا "میرا کھر نہیں جاسکتا۔"

"نہیں جاسکتا۔ وہ ہنسنا۔ مگر وہ تو چلا گیا۔" رکا "پھر بولا" تم تمہیں نے بہت رسوائی کرائی ہے۔"

امین کا منہ فیسے سے سرخ ہو گیا۔ لکھتے لکھتے غم رکھ دیا۔ اس کی طرف مخاطب ہوا۔ "رسوائی ہم سب ہی کی ہوئی ہے۔"

"ہم سب سے قہار کی کیا مراد ہے؟"

"مراد یہ ہے کہ میری بھی اور قہار کی بھی۔"

"میری بھی؟ میری کیوں؟ میں تو وہاں نہیں تھا۔" دور کا بھر کھینے لگا "لوگ اس وقت بہت جذباتی ہو رہے ہیں۔ آج مجھے ایک آدمی ملا۔ جذباتی ہو کر کہنے لگا کہ مجھے نیند نہیں آتی۔ جب آنکھیں بند کر رہا ہوں تو لگتا ہے کہ میں بیت المقدس میں ہوں اور زور ہاتھوں۔۔۔۔۔ بہر حال مجھے نیند آتی ہے جو وہاں تھے وہ اس کے ذمہ دار ہیں میں تو وہاں نہیں تھا۔"

"تم تھے وہاں؟ امین فیسے سے بولا "اور میں بھی تھا" پھر امین اٹھ اور خبریں کر رہے کرتی ہوئی مشین کی طرف چلا گیا۔

اور اس نے پیٹھے پیٹھے سامنے میر پر رکھے ہوئے رینے پوسٹ کا سوچا کھانا شروع کر دیا۔

"لطیفش" امین نے مشین پر پکے کھانے کو پیچی آواز سے کہا۔

سوچا کھانا کھاتا رہتا رہتا دور کا مڑ کر امین کو دیکھنے لگا کیا خبر آئی ہے۔

"جے وٹھم کا قال ہو گیا۔" امین مشین پر اسی طرح جھکا ہوا تھا۔

وہ پھر رینے پوسٹ پر جھک گیا۔ سوچا کھانا لگا۔ "امین عمان! مشین نہیں مل رہا۔"

بروٹلم کو عبور کر کے بروٹلم میں گیا۔ میں نے عمان و دمشق اور قاہرہ کے اڈے جانے کی خبریں سنیں اور زندہ رہا۔ پھر میں نے بیت المقدس کے اڈے جانے کی اطلاع دی اور دیکھتے دکھتے میں نے بیت المقدس کے گلی کو پہنچے میں عرب جوانوں کو یوں پڑے دیکھا۔ جیسے صبح ہوئی ہے اور ہفتے سے پچھلے پچھلے بکھرے پڑے ہیں۔ میں نے عرب جوانوں کو چنگوں کی مثال پچھلے دیکھا اور زندہ رہا۔ میں نے عرب کی کنواریوں کو لیر لیر لباس میں بال کولے زندہ دیکھے دیکھا اور میں زندہ رہا۔ اور میں چاکرا کا سے بیت المقدس کی بیٹیاں کمرے ٹاٹ ٹاٹ ہاندا ہوا دیکھ کر کہ تیرے فرزند خاک و خون میں غلطان ہوئے اور تیری کنواریاں گلی گلی رسوا ہوئیں۔ اس آن میں نے دیکھا کہ بیت المقدس کی بیٹی ہے مرمت ہوئی ہے۔ جب میں نے اپنی گھر کا آنکھیں موند لیں۔ میں اُسے دیکھا اور مر گیا۔

جیسے ہوئے چہرے غولم غولم اور دی والے سپاہی نے آنکھیں موندیں۔ قاہرہ و اڈے گیا اور مر گیا۔ ایک مرد اور اپنی روتے روتے اپنا ہمارا زمین پر پھینکا اور اپنے گیسو بکھیرتے ہوئے چلا کر عرب کے سب صحرائوں کی خاک میرے سر میں عرب کی غیرت مر گئی۔

دوسرا دور ہے بولا کہ اسے کاش میرا سر پانی ہوتا اور میری آنکھیں آنسوؤں کا سوتا ہوئیں کہ ہمارا روتا رہتا اور آنکھ کی پتلی کو سستہ نہ دیتا۔

سفید ریش امرابی نے آنسوؤں میں تر ہوتی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور رمدادی کرنے لگا۔

"القدار عذرا للقدار عذرا عذرا حاکم القادر عہد یوم یحکون الناس کالغواش المصنوث۔"

اس آن ایک بربرنگو نے کی مثال اٹھا اور نیلے پر چڑھ کر قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے غمزہ زن ہوا کہ قسم ہے سر پتہ دوڑے گھوڑوں کی اور قسم ہے ان کے سون کی جو حقروں سے نکراتے ہیں اور چنگاریاں اڑاتے ہیں اور قسم ہے اس دن کی جب کیا جھن اونٹنیاں بکرا ہو جائیں گی اور جب بیٹا دھنسی ہوئی روئی کے مثال اڑتے پھریں گے اور جب دریاؤں اور سمندروں میں آگ لگ جائے گی کہ میری حقانیام سے نکل آئی ہے اور وہ غم غم میں نہیں جائے گی۔

یہ کلام کر کے اس نے اس داغ نیلے پر آگ روشن کی اور نیام کو دو گلوں کے کر کے اس میں جھونک دیا۔ یہ دیکھ کر سب نے اپنی اپنی کنواں میں نیاموں سے لٹکائیں اور نیام تو ذکر الہاؤں میں جھونک دیں۔

"یا زارا ہست کرو۔"

"کیا" وہ چٹا سوئی اپنے ایشین سے بہت گئی تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ بہت اونچی آواز ہے۔" امین کہنے لگا زارا ہست کرو۔"

اس نے آہستہ کرتے کرتے بند کر دیا۔

"کیوں؟" امین نے اس کی طرف دیکھا۔

"یار کچھ کچھ میں نہیں آ رہا۔ یہ پتہ چتا ہے کہ کون سا ایشین ہے یہ پتہ چتا ہے کہ کیا کیا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ کوئی اور خبر؟"

"کوئی نہیں۔"

"یار اس وقت مصطفیٰ فائق کہاں ہوگا؟"

"ہوشل میں ہوگا اور کہاں ہوگا"

"میں اس کے پاس جانا چاہتا ہوں"

"اس وقت؟"

اس وقت۔"

"پتہ ہے کیا ہے؟"

"پتہ ہے تم جاس رہے ہو؟"

"مجھے کالی بکتنی ہے"

"تو میں چلا۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور درخت سے نکل آیا مگر وہ ہنوز درخت میں تھا۔ خبریں کرتی ہوئی مٹھیں کا شور۔ رینگ چوکی آوازیں۔ اس کے ذہن کی کیفیت بالکل اگلی تھی جیسے رینگ چوہیٹ کی سوئی ہو اور مختلف ہندسوں مختلف میٹروں پر گردش کر رہی ہو اس نے اپنے آپ کو سمجھا اور یکسوئی کے ساتھ اپنے آپ کو اطلاع دی کہ میں مصطفیٰ فائق کے پاس جا رہا ہوں۔ اب رات کا ایک بجھا ہے۔ میرا رخ مصطفیٰ فائق کے ہوشل کی طرف ہے۔ مصطفیٰ فائق اس وقت کہاں ہوگا۔ میں اس وقت کہاں ہوں میں مصطفیٰ فائق سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

"مستر مصطفیٰ فائق تمہارے شہر کا ایک آدمی آج مجھ سے ملا تھا۔ جیسا پتہ ہے کہ وہ کیا کہہ رہا تھا کہ مجھے ان دنوں نیند نہیں آتی۔

جب آنکھیں بند کرتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ میں بیت المقدس میں ہوں اور لڑ رہا ہوں۔

"اچھا"

"ہاں اور جیسے معلوم ہے کہ وہ آدمی کون تھا۔"

"کون تھا؟"

"مجھے لگتا ہے کہ وہ آدمی جو مجھ سے ملا تھا وہ میں خود تھا۔"

وہ آدمی جو مجھ سے ملا تھا میں خود تھا۔ مصطفیٰ قاضی رات کی اس گھڑی میں کہاں ہو گا۔ میں رات کی اس گھڑی میں کہاں ہوں۔
عنان بعد از دمشق کا ہر وہ انگریز و کون سا شہر کہاں ہے؟ کون اس وقت کس شہر میں ہے بیت المقدس میں کون ہے؟ بیت المقدس میں تو
میں ہوں۔ مصطفیٰ قاضی ہے سب ہیں کوئی نہیں ہے۔ بچے کہہ کر کے بنائے پتے کوڑوں کی طرح توڑے گئے۔ کنواریاں کنویں کرتے
ہوئے ڈال کی رسی کی مانند لڑتی ہیں۔ ان کی ہوشیاں لیر لیر ہوتاں کھلے ہیں۔ انہیں تو آفتاب نے بھی کھلے سر نہیں دیکھا تھا۔ لیر لیر
لباس میں کنواریاں اپنے کھلے بالوں کے ساتھ زمین پر چلی ہوئی جیسے وہ زمین میں سما جائیں گی۔ وہاں جب آدمی پھیلے ہوئے غنچوں
کی مانند ہوا جائیں گے۔ "ہمارے درمیان یہ تیسرا کون ہے؟"۔۔۔۔۔ میں کون ہوں۔ سلیو ریش اعرابی نے پوچھا "اے شخص
کیا تو ہم میں سے ہے۔"

میں نے کہا "بے شک میں جیسے میں سے ہوں۔"

"پھر جان کر بیت المقدس پر کیا گزری؟"

میں نے زاری کی اور کہا کہ میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ بیت المقدس کی جتنی ہے حرمت ہو گئی۔ شرم العرب شرم لغرم شرم
الغرم۔



کانا دجال

ٹیلیفون بند کیا 'براہے سے ممکن میں آیا اور اہاجان کے سونڈھے کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اہاجان نے حق پیتے
پیتے اسے دیکھا۔ "جیسے کچھ پتا چلا؟"

"نہیں اہاجان ابھی تک کچھ پتا نہیں چل رہا۔ بڑی احتیاط فرمیں آ رہی ہیں۔"

بکرہ دھانے میز پر رکھے ہوئے ٹیلیفون سیٹ پر جھک گیا اور سوچنے لگا۔ بکرہاں نے ریڈیو بند کر دیا۔ بولا "اب بارہ بجے
ہی پتا چلے گا۔۔۔۔۔ اہاجان آپ عربی تو کچھ جانتے ہیں؟"

"جیسے میں ان شہروں میں آتا ہوں بکرہاں۔ عربی بھی نہیں سمجھتا گا۔"

اہاجان حق پیتے رہے پھر سچے کی نے انگہ دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔ "یہ زمین کے سڑکی آخری منزل تھی۔"

"جی؟" "حسن نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔"

اہاجان نے تامل کیا پھر بولے "جب ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج کے لئے تشریف لے گئے۔۔۔۔۔"

چنگ پر چلی ہوئی اماں کی جھانپاں کانتے کانتے روئے نکلیں۔ انہوں نے سردتا قہالی میں دکھا اور آٹھل سے آنسو پوچھنے لگیں۔
اہاجان کی آنکھ بھرتی تھی 'مگر بند کر گئے۔ اپنے پرہیزگار کے میں شروع ہو گئے۔

آنحضور ﷺ اور یادوں پھاڑوں سمراؤں سے گزرتے چلے گئے۔ مسہر اقصیٰ میں جا کر قیام کیا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے
عرض کیا یا حضرت تشریف لے چلے۔ آپ نے پوچھا کہاں؟ بولے کہ یا حضرت زمین کا سطر قائم ہوا۔ یہ منزل آخری تھی۔ اب عالم
بالا کا سطر درجش ہے۔ جب حضور ﷺ بند ہوئے اور بند ہوتے چلے گئے۔ پہلا آسمان دوسرا آسمان تیسرا چوتھا۔ وہاں حضرت جبرئیل
علیہ السلام نے مصافحہ کیا پھر آپ اور بند ہوئے اور آخر عرض معلیٰ کے قریب جا پہنچے اور تو سین کا قاسمہ رو گیا۔"

اہاجان چپ ہو گئے۔ سچے کی نے بھارت میں لے لی۔ اماں جی روئے جاری تھیں۔ انہوں نے آٹھل سے آنسو پوچھنے چپ
ہو گیا پھر کہنے لگیں۔

”اور پچھلی مگی ہے کہ وہ اس آگہ پر ہر اپر ہوا لے رکھتا ہے۔“

“جی ہاں”

ابا جان نے غلط اسانس بھرا۔ "سب دھال کی نشانیاں ہیں۔"

اماں جی دہل گئیں۔ ”اے خداوند کرے انکی بات کیوں زبان سے نکلا ہو۔“

”میں کیا ساری مخلقت کی زبان پر یہی ہے ساری نظائیں وہی ہیں۔“

”جی اوتو اس وقت آئے گا جب قیامت قریب ہوگی۔“

”محسن کی ماں“ ابا جان حق کی نے ایک طرف کرتے ہوئے درد بھرے لہجے میں کہنے لگے ”قیامت میں اب کیا کسر رہ گئی“

11

اس فقرے نے جب اڑکیا کر لاس جی پھر رو پڑی پھر انہوں نے آنسو چھپے اور اس سے مخاطب ہوئیں۔ ”محسن! تجھے بڑی لاس

تو یاد آویں گی؟“

۴۰ "پاکستان اور چین"

”جب مگی سے ہندوؤں کی کوئی برائے ثقافتی تھی تو تو اور دیکھنے کے لئے دوڑتا تھا اور بڑی اماں چلا یا کرتی تھیں کہ بیٹے مت جا دجال

اداری نکل رہی ہے۔ میں کہتی ہوں کہ یہ تو ہندوؤں کی برائت ہے۔ کہتیں کہ بہنو جہاں بس کسی دن ایسے ہی آئے گا ساتھ ساتھ بچا

اور خود گھر سے یہ سوار ہوگا۔ تماشے باجے کی آوازوں پہ لوگ ایسے پاؤ لے ہوں گے کہ اس کے پیچھے پیچھے چلے آئیں گے۔ میں کہتی

ہے بڑی ممان کوئی اصل میں آنے والی بات ہے کہیں جاتے ہیں کی آواز کوئی ایسا پاؤں ہوا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ بہانوں کے

نہ اس کے ساتھ بہت سے ہوں گے۔ اس سال کال پڑے گا ایسا کال پڑے گا کہ خلقت ترا ترا ہو جائے گی اور حال کے

مے کے چھ منوں روٹیاں لہی ہوں گی۔ روٹی نکالے گا اس پر اسے کان سے میل نکال کے رکھے گا تو مجھے جس کے حلوہ سے

لوہے کی روئی کی جات میں اس کے چھٹے لگ جائیں گے۔“

۔ بیان سننے سننے وہ فیس بک پر اپنا جی کو اس کا منہ اٹھا نہیں گا' کہنے لگیں۔ "ہے" میں تھوڑا سی کہہ رہی ہوں میری بات تو تو

بیشتر خفی میں ازانی کے تحت تیری وادائی کیا کرتی تھیں وہ بھی قبر میں سو جاتی ہوں گی کہ کسا سعادت مند لڑکے کے مری ہوئی وادائی۔ یہ سنا

44

وہ تھوڑا کھسیا ہوا اور کہنے لگا: "اماں جی! میں تو اور بات یہ نہیں رہا ہوں۔ لوگ کان کی میل کو طوا سمجھیں گے جب سے بات لگتی ہے۔"

ابا جان اب تک خاموشی سے حق پے چار ہے تھے۔ محسن کی یہ بات من کر انہوں نے حلقے کی نے کو ایک طرف سرکا دیا اور بہت جلد

میں بولے۔ ”جیسے تم نئی روشنی داناؤں کے لئے یہ فہمی کی باتیں جہاں مگر غور کرو تو اس میں صبر کی بات بھی ہوئی ہیں۔ ہمارے رسول

اور آئندہ کو سب کچھ معلوم تھا کہ آگے چل کر کیا ہوگا اور میں تو یہی سوچ سوچ کر حیران ہوتا ہوں کہ کل تک کتنی انفرافونکسی اور اب

رزق کتنا کم ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ محسن کی ماں چھٹیں پا رہے ہیں جب بڑے پانچ سو تھے تو گریہوں کا کیا بھاء تھا۔"

اماں جی ترست ہوئیں۔ ”اُمّی“ میں تو یہ چانوں ہوں کہ بڑے ابا مینے کی پہلی تاریخ کوڑھائی روپے لے کر منڈی جاتے تھے اور

گیجوں کی پوری حدود کے سر پہ اٹھوا کے لاتے تھے۔

پھر ادا جان برے۔ ”جتنے یہ ابھی گل کی بات ہے اب ڈھائی روپے کا گیہاں خدا جھوٹ نہ بلوائے میری مٹھی میں آ جاتا ہے۔

اب جب تک امریکہ سے گئے ہوں تو آئے ہمارے پوری فہمیں پڑتی اور امریکہ ہمیں دیتا کیا ہے جو دیتا ہے وہ اس کے کان کا میل ہے۔"

ابا جان کے بچے میں کچھ ٹھنکی آ گئی تھی۔ بس اسی لئے اسے بولنے کی ہمت نہیں ہوئی، ورنہ اسے یہ بات اکھر دی تھی کہ ابا جان

نے کہاں کا رشتہ کہاں جا ملا۔ بات کانے وہ جہاں کی تھی تان انہوں نے توڑی امر کی ادا پر محروم کیسے ہو گا کہ با جان اس وقت برہم

تھے پھر اچانک ان کے لہجے میں رقت آ گئی۔ ”مسلمانوں پر بہت برا وقت ہے۔“ ”رکے پھر کہئے گئے۔“ ”زوروں میں پی آ یا ہے کہ کانا

وہاں جب آئے گا تو مسلمان چین چین کر رہے جائیں گے۔ آخر میں تین سو تیرہ مسلمان رو جائیں گے۔“

”تین سو تیرو“ اس نے قہقہے سے پوچھا۔

ہوئے۔ "ہاں تین سو تیرہ۔ بہت سے مارے جائیں گے بہت سے وہاں کے گھر کے پیچھے لگ جائیں گے۔ صرف تین سو

تحریر: ایمان علی

ابا جان نے غلط اسانس بھرا۔ "خدا اسلطانوں پر رحم کرے۔" اور پھر حد پہنچے گئے وہ قہقہوں اور ایسے ہنسا رہا جیسے ہندو خدا ہنسا

ہے۔ پھر آہستہ آہستہ سے اٹھ کر برآمدے کی طرف چلا۔ اس جی نے پیچھے سے آواز دی۔ ”بیٹا! زرا پھر انہماک کے دفتر میں بیٹھ لیوں

"3/

اس نے خلیفوں پر جا کر اہل گمراہی، جہل و اعلیٰ حین منہ بات کی پھر وہیں خاموش کرسی پر آ بیٹھا۔ اچانک نے اس کی صورت

خوار سے دیکھی ہو چھا۔

”کوئی خبر ملی؟“

اس نے کروت لی اور سوچا میں باغی میں ہوں یا مستقبل میں ہوں۔ باغی حال مستقبل یہی اری خواہ سب کہو گئے تھا۔ جیسے وہ جاگ رہا تھا اور سوچی رہا تھا۔ جیسے وہ باغی حال اور مستقبل کے نقطوں میں کھراڑا تھا۔ تین سو تیرہ۔ یہ ہمارا باغی ہے یا مستقبل ہے؟ جو آواز تھا وہی انعام بھی ہے جہاں ہم بند ہوئے تھے وہاں ہم پست ہو گئے۔ کاٹا دھال تاشے پائے کے ساتھ آئے گا کاٹا دھال کاٹا کاسیل گدھا کیوں امریکہ۔۔۔۔۔ میں باغی میں ہوں یا حال میں ہوں وہ سوچی رہا تھا اور جاگ بھی رہا تھا اور جب وہ جاگا تو وہ سوچنے لگا کہ کیا وہ سو رہا تھا۔ اس نے آسمان کو دیکھا۔ آسمان اب اہل اہل ہو چلا تھا۔ ستارے بہت محدود ہو گئے مگر تھوڑے اب بھی جہاں تھاں جھلک رہے تھے اور وہ چمکناڑی جس پر ستاروں کی دھول بکھری ہوئی تھی؟ اس نے سوچا کہ شاید کچھ کھانیاں رات کو منور ہوئی ہے اور صبح ہوتے ہوئے بجھ جاتی ہے تو کیا اذان ہو چکی ہے۔ پتہ کس اذان ہو چکی تھی یا ابھی نہیں ہوئی تھی مگر دور کے کسی گھر سے مرغ کی اذان سنائی دے رہی تھی اور جب اس نے کروت لی تو دیکھا کہ الہامی چوکی پر جا رہا تھا بھانے سہ سے میں جھکے ہوئے ہیں انہاں ہی کا چنگ اٹا پڑا ہے اور وز میں پر جا رہا تھا بھانے قلع باغ میں لے آتھیں موندھے جھمی ہیں۔



بگڑی گھڑی

سامنے دہلی دکان سے رجم جو اس بحث پر مستقل کان لگے ہوئے تھا۔ موتی چور کے لٹو گوندھتے گوندھتے اونی آواز سے بولا۔ "ابو بھوئی تیرا علم کیا کہو ہے۔"

گم عثمان سینک سلائی ابو بھوئی نے نے دیر سے آکڑوں جیٹا سلیٹ پر غانے بنائے اور مٹائے جا رہا تھا۔ ہاتھ کو روکا آتھیں بند کر لیں۔ پھر آتھیں کھولیں۔ اور اسی طرح گھنٹوں میں سرتے سلیٹ پر نظر میں بنائے بولا۔ "مطارادہ مشتری و قمرادہ سحر جن کو شہرہ کہتے ہیں اور آفتاب و مرتضیٰ ذب جن کو پاپ کہتے ہیں اور اس دھل کر بعض حالت میں سعد یعنی چنگ اور بعض حالت میں نفیس یعنی مکروہ کہتے ہیں اور جب خانہ میزبان میں آفتاب اور خانہ جدی میں مشتری اور خانہ سہیل میں زہرہ اور خانہ صل میں دھل اور خانہ قوس میں داس ہو تو خوش ساعت وہ خانہ سلطان میں ہے۔ پس اگر خانہ سلطان سے ساعت ختم ہونے سے پہلے نکل آتا تو بھلا ہے اور اگر دوسری ساعت لگ گئی تو انا دہ ہٹا کی بے گناہ ہے ہاں کاٹا لیا ہے۔"

ابو بھوئی چپ ہو گیا آتھیں بند کر لیں۔ حاجی تڑپ طم طم م ہو گئے تھے اور ماسٹر نیاڑ سیاہ رنگ مچھلکاڑا کھ سے چپکائے دھکن مکلی گھڑی کے بند پر زوں کو بکھوئی سے دیکھے جا رہے تھے۔ میں نے میز پر پڑی ہوئی کتاب کھول لی تھی اور بلا وجہ ایک صفحہ پر نظر میں جمائی تھیں۔ سامنے کی دیوار گھڑی جو تین دن سے شام کو دو بجہ کا اور دو بجہ کا گھنٹہ بتا رہی تھی چپک چپ حرکت میں آئی اور سن ٹن ٹن بھاڑا لے۔

رجم ابو بھوئی آواز میں بولا۔ "حاجی صاحب ابو بھوئی کا تو انا علم ہے۔ میں تو علم والا نہیں پر میں نے جوتی اچھال کے بتا دیا تھا کہ ہندوستان پاکستان میں لڑائی ہوگی۔ اور یہ تو ابھی کی بات ہے بچہ چلو ابو بھوئی سے۔ اس کے سامنے میں نے جوتی اچھال لی تھی۔ جوتی چت گری میں نے صاف کہہ دیا۔ صیاد ایک چت ہو گئی۔"

حاجی تڑپ علی غلط اسانس بھرتے ہوئے افسردگی کے لیے سوئے۔ "مہاں کوئی چت نہیں ہوا۔ چت تو پاکستان ہوا ہے۔" چپ ہوئے کچھ سوچنے لگے پھر بولے۔ "مولوی اکبر علی اللہ انہاں کروت کروت جنت نصیب کرے بھوئی دجوتی تو تھے نہیں نہ حال

تھے۔ ہاں عبادت گزار بہت تھے۔ ان کی کمی ہوئی ایک ایک بات پوری ہو رہی ہے۔ میں نے ایک مرتبہ سوال کیا کہ مولوی صاحب مجھے جج بھی تعجب ہوگا۔ فرمایا کہ جوقدم جہاں سے ہمیں گئے۔ وہاں واپس نہیں آئیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جج سے ہمارے واپس ہوتے ہوئے سارا قبیلہ یہاں آگئی چکا تھا۔ پاکستان کے بارے میں میں نے ان سے سوال کیا تو چپ سے ہو گئے۔ پھر فرمانے لگے کہ جو جج بہت سے تھوڑی رہ جائے گی۔ جو تھوڑی ہے بہت ہو جائے گی۔ اس وقت تو نہیں مگر اب یہ بات مجھ میں آ رہی ہے۔ گجپاں یہاں کتنا ہوتا تھا مگر اب.... اب دیکھ لو۔ اور حق تھوڑی کے بہت ہونے کی بات تو بھائی تو ایک ہے پردی کوئی لے لو۔ ہمارے زمانے میں بن خان صاحب والے تھے جن کی لڑکی نے پردہ چھوڑ دیا تھا۔ اب شے دیکھو بے پردہ۔

ماستریانے خاموشی سے چپچپے والی پیشی کی الماری کھول دوسری گھڑی نکالی۔ لاکھن کھولا کہ اس کے کھینے ہی ختمے نازک پڑوں کا تیز بار یک شور ہوئے لگا۔ پھر اسے بند کیا چانی گھرائی کان سے لگا۔ پھر اسے حاجی تراب علی کو دکھاتے ہوئے کہنے لگے۔ "حاجی صاحب میں تو یہ جانتا ہوں کہ گھڑی ہے۔ میرے پاس درستی کے لئے آئی ہے۔ اگر میں یہ کام جانتا ہوں اور ادا ادا ہوں تو گھڑی درست کروں گا۔ اگر نہیں.... تو میرے ہاتھ میں آکر گھڑی بگاڑ جائے گی۔ یہ موتی بات باقی رہا آپ کا مجرم آپ کے عاملوں کی ہاتھ قویں مانتا نہیں۔"

الوجھی نے اک دقار سے گھٹنوں سے سر اٹھایا اور ویران آنکھوں سے ماستریانہ کو گھورتے ہوئے بولا۔ "ماشریم اندھے خدا ہیں۔ بس ہم نے کہا تھا۔"

ماستریانے جواب میں پھر کھینچا نرا آنکھ سے چپکالیا اور گھڑی کا دھکن کھول پڑے دیکھنے لگے۔
الوجھی ماستریانہ کو بدستور گھورے جا رہا تھا۔ ماشری نے اندھا عالم ہے۔ ہم اندھے خدا ہیں۔ اب سوچو چاند یاں سے کتنی دور ہے...."

ماستریانے گھڑی کے پڑوں کو اسی طرح دیکھتے دیکھتے بات کائی۔ "اب زیادہ دور نہیں ہے۔"
الوجھی نے ماستریانہ کی بات سنی ان سنی کی اور پھر کہنا شروع کیا۔ "چاند یاں سے کوسوں دور ہے۔ مگر ہم یاں پیٹھے پیٹھے بتا سکتے ہیں کہ چاند گرہن کب پڑے گا۔ جب چاند گرہن کا وقت بتایا جاسکتا ہے تو آدمی کو زمین پہ چلتا پھرتا ہے تو اندھ کا ہڈپتا ہے اور بھول چوک سے جاتا ہے۔ اس کی باتوں کا کیا پتہ نہیں چلا یا جاسکتا۔ اور جانتے ہو ماشر اندھے سے پاس حضرت آدم کی خیم پڑی بنی رہی ہے تو جب حضرت آدم کی خیم پڑی بنی سکتی ہے تو پھر کون سا آدم ہے کہ اس کی خیم پڑی تیار نہیں ہو سکتی۔"

حاجی تراب علی نے ڈاڑھی پہ ہاتھ پھیرا پھر بری لی "اللہ اکبر" اور چپ ہو گئے۔ ماستریانے آنکھ سے کھینچا نر بنایا اور گھڑی کو میز کی دراز میں احتیاط سے رکھتے ہوئے بولے۔ "الوجھی تمہارا علم عہد قدیم کی یادگار ہے۔ سائنس بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ اب ستارے انسان کی قسمت سے بے گناہ نہیں رہے۔ انسان ستاروں کی قسمت کا حقار ہوگا۔"

سیک سلائی الوجھی کی گھوڑی ہوئی ویران آنکھوں میں جو ہر کسی کی کیفیت پیدا ہوئی تھی۔ قاتب ہوئی اور کسی گھڑی سوچ کی سی کیفیت پیدا ہوئی کہ اس نے ویران آنکھوں کو اور ویران بنادیا۔ اس نے بڑی تنہید کی سے انکار میں سر ہٹایا اور کسی قدر ماسرہ لہجہ میں بولا۔ "ماشر! ستاروں کی اپنی ہی چال ہوتی ہے۔ اس میں آدمی کچھ نہیں کر سکتا.... آدمی بہت مجبور ہے کچھ نہیں کر سکتا۔"
الوجھی نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر گھٹنوں میں سر دے کر ساری گھنٹوں سے بے حلق اور بے نیاز ہو گیا۔

حاجی تراب علی اپنی بچھڑی ڈاڑھی پہ ہاتھ پھیرتے پھیرتے خیالات میں کھوے گئے۔ پھر جبری جبری کے ساتھ اکبر کہا۔ تامل کیا۔ پھر ماستریانہ سے مخاطب ہوئے۔ "ماستریانہ صاحب آپ کی سائنس نے آپ کہتے ہیں کہ بہت ترقی کر لی ہے۔ مگر کیا کسی ماسکدان نے آج تک چاند کو دھکے کر کے دیکھا ہے؟"

ماستریانے حاجی تراب علی کو دیکھا اور جواب میں سامنے رکھی ہوئی قاتم چیں کو اٹھایا اور چابی گھمائی شروع کر دی۔
حاجی تراب علی نے جبری جبری لی۔ "اللہ اکبر کیا شان ہے۔ قرقری طرف اٹھی اٹھائی شق ہو گیا۔ سورج کی طرف اشارہ کیا۔ غصے کیا۔ ننگریوں کو اٹھایا۔ کھڑے پڑنے لگیں اور دھن و میوہ.... "حاجی تراب علی کی آنکھوں میں ایک خواب سائیرنے لگا۔ پیرے کے خطوط میں نری آنکھی اور پھر دھما ہوا کیا۔ "صاحب کیا منظر ہوتا ہے دھن پاک پر۔ مگر یاں پھر یاں پھٹتی ہیں جیسے بادل مگر کے آئے ہوں۔ دھن پاک کی گچھوتوں پہ مچھائی پھیل جاتی ہے اور گچھوں پر داڑھیں پھٹتی ہے۔ دن گرہند پاک پر پیٹھے رہتے ہیں۔ کیا محال کہ ایک سیٹ بھی کہیں نظر آ جائے.... اللہ اندھے سے اندھے تو احترام کریں اور ہم انسان بگڑے کو نہیں معاف.... "حاجی تراب علی کی زبان کان گئی۔ جسم میں ایک حرر جھری اڑنی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

ماستریانے آہستہ سے غامضی کا دھکن کھولا اور پہلے آنکھوں کے قریب لاکر دیکھا۔ پھر کان کے برابر کر لیا۔ کیسا ہی عقیدہ مسئلہ ہو ماستریانہ اپنے کام کے تسلسل میں فرق نہیں پڑنے دیتے۔ ان کی دکان میں چاندوں طرف گھڑیاں ہی گھڑیاں کھائی دیتی ہیں۔ پھر جگہ یہاں چند کثرت سے آگاہ رہتا تھا مشکل ہے کہ پھولی بڑی گھڑیوں میں ہر گھڑی ایک سے بارہ تک سب بیچے نظر آتے ہیں۔ ماستریانہ کی دکان میں ہر وقت ادا کا بلور ہوتا ہے۔

اس کی خشک عمارت نے جلدی چیز اڑ کر دیا اور آنکھوں میں ترسے آگئے۔ میں نے کتاب بند کی اور ایک لمبی سی بھائی لی۔

ابو الجوحی کے سامنے ایک عورت ٹھہری زارو قطار رو رہی تھی اور ابو الجوحی کہہ رہا تھا۔ ”عورت تیرا ستارہ تیرے آسمان پہ ہے اس کا ستارہ پانچوں آسمان پہ ہے۔ دونوں کا ملاپ ابھی نہیں ہوگا۔“

”بابائی کچھ کرو۔“ سسکیاں لے کر رونے لگی۔

ابو الجوحی نے خاموشی سے کاغذ پہ نقش بنایا تو بچی پہ ہنسنے آگئے۔ ”بھئی، بند کیں بھر کھولیں اور بڑا نہ لگا۔“ دو ستارے کے مقابل ایک دوسرے کے ہیں۔ سلطان زور بادہ زور صورت کا سلطان صورت نکیرا ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور جٹ جاتے ہیں کہ لڑائی میں ایک تیسرا ستارہ صورت حوت جھلی کے موجود ہے جو ان میں تفرقہ ڈالتا ہے۔ جانا چاہئے کہ نقش روحانی عورت لگے میں ڈالتو یہ تیسرا ستارہ لڑائی میں سے ہٹ جائے اور دونوں ستاروں کا ایک برتا میں میل ہو۔“ بھڑاس نے عورت سے خطاب کیا۔ ”اے عورت اس وقت تو چلی جا۔ جوں کی جگہ کوسوں گز لٹھا اور وہ پاؤں پان اور بازو چھنا تک زعفران لے کے آنیو نقش روحانی نکھیں گے اور انشا واللہ جی حیران ہو جائے گی۔“

عورت چلی گئی۔ میں بھر پور ہوا۔ ”یہ بے چاری عورت تو بہت رو رہی تھی۔“

”یاس آج آتا ہے وہ آتا آتا ہے۔“

اس نے گھٹنے پہنوزی لگائی اور چاک ہاتھ میں سے سلیمت پہ نقش بنانا شروع کر دیا۔ ٹھوڑی کو اس طرح گھٹنے پہ لگائے۔ سلیمت پہ نقش بنائے نقش بناتے بناتے ہوا۔ ”ایک کونہ باجی۔ دو تو بات ہی نہیں کرتی تھی۔ بس رو رہی تھی۔“ اس نے نقش کو دھوا چھوڑ دیا۔ ہاتھ روک کر میری طرف دیکھا۔ میں سمجھا کرتا گئے کوئی بات کرنے کا۔ مگر اس نے اور ہی سوال کر ڈالا۔ ”باجو یہ جہاں ماشر ستاروں کی چال کو نہیں مانتا؟“

”نہیں۔“

”اور سائنس بھی ستاروں کی چال کو نہیں مانتی؟“

”مانتی بھی ہے اور نہیں مانتی۔“

”کیا مطلب۔“

”مطلب یہ کہ اس طرح نہیں مانتی جس طرح علم مجہم مانتا ہے۔ سائنس کی کوشش تو یہ ہے آدمی خود ستاروں میں کچھ جانے۔“

برابر میں سڑک کے کنارے ابو الجوحی اپنی جمل رو رہی بھائی لٹوئی سی ایک صندوقی ساٹنے دھرے صندوقی کے آس پاس کتے کے کھڑے کھائے کسی پہ چاٹ رہا ہے۔ کسی پہ نقش روحانی۔ کسی پہ جایات و ملیکات سر نیوڑے حائے پہلے کاغذوں والی کسی پر اپنی دھروانی کتاب پہ نقش بنائے بچھا رہا ہے۔ آسمان کے ستاروں کو ٹھوڑی کی سونیاں نکھتا ہے اور سلیمت پہ چاک سے نقش بنا کر بتاتا ہے کہ کس شخص کی قسمت کی ٹھوڑی کسی کی ٹھوڑی کیا بھائی گی۔

دوسرے دن میں گھر سے سویرے نکلا۔ حاجی تراب علی ابھی تشریف نہیں لائے تھے ماسٹر نواز دکان خالی چھوڑ کر جانے کیا ان چلے گئے تھے۔ ماسٹر نواز دکان سے دو ٹھیلوں تو سارا دن نہ ملیں۔ دھنچے ہیں تو ٹھکنوں خالی پڑی رہتی ہے۔

میں نے کڑی دروازے کے قریب گھسیٹی اور چلے گیا۔ ابو الجوحی اپنے ایک دیہاتی کا کب سے لگا ہوا تھا۔ دکا خدار اور کابک دونوں گم تھے ایک عراقت میں دوسرا امید و حکم کے دھندے میں۔ بھر الجوحی نے اچانک یلٹنا شروع کر دیا۔ ”عطار دوشتری زور ہو سہر کینیت عطار دی ہے کہ جب باہم سہر کے ایک خانے میں ہو۔ جب شروہ یک اور جب باہم ستارہ جس کے ہوا شروہ عہد میں آتا ہے۔ حیرا ستارہ دوشتری ہے کہ شروہ کہے پر ان دونوں وہ خانہ جہی میں ہے کہ تیرا اس کا اندہ ہونا ہوگا۔“

دیہاتی بہت گھبراہٹا۔ جب ابو الجوحی نے بڑی بے نیازی سے حدیث کی ”جا بابا اس وقت کچھ نہیں ہو سکتا۔ جوں کی جگہ کوسوں گز لٹھا اور آدھ پاؤں پان اور بازو چھنا تک زعفران لے کے آنیو نقش روحانی نکھیں گے اور تیرا ستارہ کہ شہر ہے اس وقت خانہ جہی میں ہے۔ خانہ جہی سے نقش آئے گا۔“

جب دیہاتی چلا گیا تو میں نے یونہی پوچھا۔ ”ابو الجوحی ہر جا کب سے جوں گز لٹھائیے ہوں گا کیا کرتے ہو؟“

ابو الجوحی نے بڑے وقار سے ٹھکنوں سے سراٹھایا مجھے گھورتا ہوا ہوا۔ ”باجو تیری کچھ میں یہ بات نہیں آئے گی۔“ اور بھر سلیمت پہ نقش بنانے میں مصروف ہو گیا۔

ابو الجوحی جو نقش بناتا ہے میری کچھ میں وہ کبھی نہ آئے۔ میری کچھ میں تو یہ بات نہیں آتی کہ آخر سلیمت پہ بار بار کیوں نقش بناتے جائیں اور مٹانے جائیں ابو الجوحی جب کبھی نقش چاک سے بنا کر بازو چھنا تو اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ”باجو یہ دنیا حاصل ہے خال حاصل۔ ہر شخص اپنی لہذا کے مطابق اس حاصل کو بھینٹا ہے۔“

میں اسے کبھی سلیمت پہ بنا ہوا ایک نقش بکھا اور چپ ہو رہا۔

نواز صاحب کی میز پر ایک کتاب پڑی تھی۔ خالی سے بیکار رکھی۔ میں نے یہ کتاب اٹھائی اور اداہت پلٹ کر دے دیکھنے لگا۔ لیکن

ابو نعیمی کی آنکھیں پانی کی بجلی رہ گئیں۔

پھر اس کی سادک جسم کو بخش ہوئی اور وہ ان آنکھوں سے قہر کا رنگ غائب ہو کر افسردگی کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ "ابو تاروں کی اپنی چال ہے۔ آدمی بھروسہ ہے۔ وہ اس میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

اس نے بائیں گھٹنے پہٹھی رکھی یعنی پہلوڑی لٹائی۔ یہ سب دھڑ سے سلیٹ سرکاری اور پھر قسطنطنیہ کا شروع کر دیا۔

"روز وہ آ جاتی۔ اور آ کر چپ چاپ بیٹھ جاتی اور بیٹھی رہتی۔" اس نے بغیر ٹونس دینے پرانا شروع کر دیا تھا اور اس نے بھی درمیان کی ساری مشکوک بھول کر سر سے سر اٹھایا۔ وہ کھینچے پہٹھی رکھے پہٹھی پہٹھی لٹائی نظر میں سلیٹ پہٹھے بول رہا تھا۔ "پہٹھے تو میں نے دھیان نہیں دیا۔ پر اس کی بھولی صورت دیکھ کے میری ذہن لگا۔ پچھما کر لی لی کیا چاہتی ہے تو وہ دروازہ بند ہے۔ بہت روٹی۔ پر کچھ نہ بتایا۔ کیا بتائی لذت اٹھا دے گیا۔ دوسری سے باہر چلا گیا۔ بس اس روز سے آجیٹا کھانا نہ چلانا۔ بس روئے رہتا۔ گورے کال سارے پیچھے جاتے۔ جگنو آنکھیں سرخ ہوتی ہو جاتیں۔ پھر غریب آ جلی سے پیچھے کال ترختر آنکھیں پر چھٹی اور بے کہے بٹے اللہ کر چل جاتی۔ جب وہ چل جاتی تو پھر میں..... وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔"

"عقل روحانی نہیں بنایا اس کے لئے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

وہ چپ سا ہو گیا۔ پھر بولا۔ "دنیا احوال ہے خالی احوال۔ ہر شخص اسے اپنی بساط کے مطابق دیکھتا ہے۔ تاروں کا علم احوال ہے۔ تاروں کی اپنی چال ہے۔ اس میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ کسی پہ چڑھتی ہے اور رکھ لے کر ہمارے پاس آتا ہے۔ تو ہم اسے قتل دے دیتے ہیں۔ کچھ دیتے ہیں۔ کچھ لیتے ہیں..... اس سے ہم نے کچھ نہیں لیا..... اور کچھ دیا بھی نہیں۔" بہت غراہی ہونے لگی تو صاف کہہ دیا کہ سرطان نروداد۔ تیسرا تارہ حوت جھلی کی صورت درمیان میں آ گیا۔ تفرق ذال دیا۔ ہم اس کا شیل نہیں۔ کیوں غراب ہوتی ہے اور کیوں غراب کرتی ہے۔ ہمارے عمل میں غفل آتا ہے..... "اس کی آواز آہستہ سے آہستہ ہو گئی۔" وہ چلی گئی۔ پھر گھبراہٹ آئی۔"

اس نے چاک اٹھایا اور پھر قسطنطنیہ کا شروع کر دیا۔ اسے ہمارے سارے سے عقل بنانا شروع کر دیا۔

"حالی صاحب نہیں آئے ابھی؟" باسٹریا زور چاک سانگیل سے اتر دکان میں داخل ہوئے۔

"نہیں۔" اور ساتھ ہی میں اللہ کھڑا ہوا۔ انکو لی لی اور پہٹنے لگا۔

"ابھی آ جاتا۔ اور میں دکان سے نکلے سوچے کچھ نکلے پڑا۔"

ابھی تھوڑی دیر ہوئی تو میں کمرے نکلا۔ تھا۔ پھر بھی کچھ ایسا لگا رہا تھا کہ کتب گیا ہوں اور میں تھا افسردہ افسردہ رنگ۔ بازار میں بے مقصد بے مطلب گھومتا رہا۔ جب واپس ہو کر باسٹریا زور کی دکان پر پہنچا تو یہ اندازہ نہ کر سکا کہ میں کتنی دیر گھومتا رہا ہوں کیونکہ ہر گھڑی الگ وقت بتا رہی تھی اور باسٹریا زور کی کرسی کے میں آگے گھڑا کر دو اور انگڑی آج بھی کھینچے تین دلوں کی طرح نوٹھا رہی تھی مگر کھٹ کی گئی ہے یہ ضرور اندازہ نہ تھا کہ قاضی دیر سے عمل گرم ہے۔

حالی تراب علی بہت گرمی میں تھے اور کہہ رہے تھے۔ "تم کہتے ہو کہ آدمی چاند میں پہٹتی جاتے گا۔ چلو مان لیا۔ مرغ میں پہٹتی جاتے گا۔ یہ بھی مان لیا۔ یعنی قہاری سائنس کی معراج مرغ ہے۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ اب سے سینکڑوں برس پہلے جب قہاری سائنس مسٹر پیو ابھی نہیں ہوئی تھی۔ انسان چاند اور مرغ سے بہت بلند یعنی عرش تک۔"

"ابو نعیمی آج دکان سو رہے بدھادی ہے۔" رحیم ابو نعیمی کو دکان بدھاتے دیکھ کر حالی تراب علی کی بات سے توجہ ہٹا کر ابو نعیمی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ابو نعیمی اپنا چہرہ نوٹا سامان سینچنے میں مصروف رہا۔ اور رحیم کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ باسٹریا زور کی گرد آلود گھڑی پر ایک حرکت میں آئی اور ان دن بارہ بھاڑا لے۔

"نوشی آپ کی گھڑی نے شام پڑے بارہ بھاڑے۔" رحیم باسٹریا زور سے اپنی اسی بلند آواز کے ساتھ مخاطب ہوا۔ "ابھی میں کہوں ہوں کہ آپ سب کی گھڑیوں کو مرمت کریں ہیں۔ اپنی گھڑی مرمت کیوں نہیں کر لیتے۔ اس کھٹ بگڑی گھڑی کی مونیاں بیٹھ لفظ وقت بتاتی ہیں۔"

باسٹریا زور نے آنکھ پر کھینچا نروداد اور کھائی کی ایک گھڑی کا لائن کھول کر اس کے پرزوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ابو نعیمی نے درجہ لپیٹ کر باسٹریا زور کی دکان کے کھینچے کے پیچھے رکھی۔ صندوق پہٹتی بغل میں دایا۔ پھر پہٹنے باسٹریا زور کی طرف رخ کر کے کھڑا ہوا اور دھڑ سے بولا۔ "باسٹریا زور سائنس کا علم احوال ہے۔ تاروں کی اپنی چال ہے۔ اس میں آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔ آدمی بھروسہ ہے۔"

ابو نعیمی آگے بڑھ لیا اور چاند میں چل کر اپنی گلی میں مڑ گیا۔

باسٹریا زور نے آنکھ سے کھینچا نروداد چھوڑ دیا اور ہاتھ میں قاضی بھولی کھائی کی گھڑی کے پرزوں میں آواز اسے حرکت کرنا رہا۔

حالی تراب علی کے چارے جسم میں حرّ جہری دوڑ گئی۔ "بے شک آدمی بہت مجبور ہے۔" اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔



دوسرا گناہ

اس دن ایٹسک دسترخوان سے بھوکا اٹھا۔ اس نے زمران کے سامنے رکھی ہوئی روٹی پر نظر کی۔ پھر دسترخوان پر چلی ہوئی روٹیوں کو اور لوگوں کو دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا اور یہ دو لوگ تھے۔ جو دور کی زمین سے چل چل کر یہاں پہنچے تھے۔ ان کی زمین ان پر شکست ہو گئی تھی۔ انہوں نے اپنے مسجدوں اور مقبروں اور عیالوں کی طرف پشت کی اور کہا کہ بے شک اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ پہلے ایک گھر اٹا آ یا اور یہاں تکلی کی کھلتے آسمان میں سخت زمین پر پڑ رہا۔ پھر دوسرا گھر اٹا آیا اور زمین کی سختی سے ٹرنے لگا۔ پھر گھرانے آتے چلے گئے اور اونچے درختوں کو سرنگوں کرنے اور سخت زمین کو نرم بنانے پر جت گئے۔

جب وہ سب اکٹھے ہو گئے تو انہوں نے حشام سے کہا کہ اسے حشام تو ہم میں بڑا ہے۔ پس تو ہمارے بچے عیال اور مصلیٰ کر۔ حشام ان کے بچے بیٹا اور خوب مصلیٰ کی۔ اس نے انہیں تا عمر سات پیٹا۔ اور سب کے ساتھ ایک سو میٹر برس کی عمر پائی اور جب دوسرا تو اس کی کمر سیدھی تھی۔

حشام کو یاد کر کے لوگ بہت رونے۔ پھر انہوں نے اس کی نکلی جورو کے بیٹھوٹی کے بیٹے زمران کو اپنے بچے بیٹھا یا اور کہا کہ اب تو اپنے باپ کی جگہ ہمارے درمیان مصلیٰ کر۔

اس باپ کے بیٹے نے بھی خوب مصلیٰ کی۔ پھر ایک دن یوں ہوا کہ آبی ملک نے دسترخوان پر بیٹھے ہوئے زمران کے آگے رکھی ہوئی روٹی پر نظر کی اور اس کے اگلے پین کو دیکھ کر حیران ہوا اور اس نے دوسروں کے سامنے رکھی ہوئی روٹیوں کو دیکھا کہ اپنی اعلیٰ نہ تھیں۔ پھر وہ زمران سے مخاطب ہو کر یوں بولا کہ اے حشام کے بیٹے کیا تو اب چھپنے ہوئے آنے کی روٹی کھائے گا۔ اور میں نے تیرے باپ سے اور تیرے باپ نے اپنے باپ سے سنا ہے کہ جب گہوں کی جنگ گہوں کے چھٹکنے سے جدا ہو جائے تو گوشت ناخن سے جدا ہوتا ہے اور گہوں تھوڑے اور بھوک زیادہ ہو جاتی ہے اور گہوں ہمارا پالنے والا اس دن سے پناہ میں رہ گئے کہ ہمارے درمیان گہوں تھوڑے اور ہمارے بھوک بڑھ جائے۔

اس دن ایٹسک دسترخوان سے بھوکا اٹھا اور جب وہ دسترخوان سے بھوکا اٹھا تو بہت سی میں اس کا چرچا بہت ہوا۔ لوگ پہلے حیران

ہوئے اور وہیں سے سرگوشیاں کیں کہ اہلک دسرخوان سے نواں توڑے بغیر اٹھ گیا اور اس نے زمران سے اپنی روٹی الگ کر لی۔ پھر وہ اڑے کر کچا کچ گھسیں اپنے پھلکے سے جدا ہو گیا ہے۔

زمران نے لوگوں کو دیکھا اور فسر کیا اور جس جس نے جی اپنی طاہری اور خوف کا اعلان کیا۔ اس کا دسرخوان اپنے دسرخوان سے الگ کر دیا۔ سو جہاں ایک دسرخوان تھا وہاں بہت سے دسرخوان ہو گئے۔ پر زمران کا دسرخوان مختصر ہو جانے پر بھی کھینکا ہوا رہا۔ اس کے آڑی اور جاری دونوں وقت اس کے ساتھ دسرخوان پر پیٹتے رہے اور چپے ہوئے آنے کی روٹی کھاتے۔

زمران کے دسرخوان کے لئے آٹا بیک بپا جاتا تھا اور ایک بڑی سی چھٹی میں چھتا جاتا تھا اور زمران نے چپے ہوئے آنے کی بھوی کو کچ کر تشہش کی۔ زمران نکس چاہتا تھا کہ لوگوں کے درمیان کچیاں تھوڑا رو جائے اور ان کی بھوک بڑھ جائے۔ تو اس نے یوں کہا کہ بچی ہوئی بھوی کو لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ پس جنہیں آٹا کھ ملا جس بھوی زیادہ مل گئی۔ انہوں نے اپنے آپ سے پھینکے آنے میں بھوی کا رسوئی روٹی پھٹی اور سیر ہو کر کھا لی اور زمران کے آنے سے چھٹی بھوی چھٹی قحی لوگوں میں تقسیم ہو جاتی قحی اور ان کے بے پھینکے آنے میں مل جاتی قحی۔ تو یوں زمران کے دسرخوان کی روٹی کی رنگت اور طاقت کی روٹی کی رنگت اور ہو گئی۔

زمران کا آٹا پھینک چھٹی میں چھتا گیا مگر پھر زمران کو احساس ہوا کہ آٹا چھٹی میں سوتا چھتا ہے۔ اس نے بار یک چھتا کی ترکیب یہ نکالی کہ بہت بار یک کپڑا خواہا اور اس میں چپے ہوئے آنے کو مزید چھتا۔ حتی کے آٹا مزید ہو گیا اور روٹی زیادہ چھٹی اور زیادہ خاتم ہو گئی۔ اس حساب سے بھوی زیادہ پکڑی اور زیادہ لوگوں میں تقسیم ہوئی اور زیادہ ان کے آنے میں آہیز ہوئی اور زمران کی روٹی کی رنگت اور لوگوں کی روٹی کی رنگت میں زیادہ فرق آ گیا۔

زمران نے بار یک کپڑا آٹا چھوانے کے لئے بنوایا تھا۔ مگر پھر یوں ہوا کہ وہ کپڑا اسے اپنی پوشاک کے لئے بھا گیا اور سدا سے سونے تاج کی سنگت سونے کپڑے سے اور بار یک تاج کی سنگت بار یک کپڑے سے چلی آتی ہے تو زمران نے تاج اتار کر بار یک کپڑا خود بھی پہنا اور اپنی جینی رافہ بھی پہنا اور رافہ اس کی جینی قحی جس نے مگر بھرتا اتار حار اوکل چلائی۔ وہ ایک وقت میں ایک سن آٹا یوں کر چھٹی قحی اور سستی کے بڑے سن والے کو یوں پر جا کر سوا دل پانی کے چھٹی قحی۔ بدن اس کا تہنے کی طرح تھمتا تھا۔ اس کا تاج بدن سے زمران بڑے کو یوں کی من پر گھرایا اور کھاس کے گرم بسز پر اس کے سنگ بسز میں گیا۔ پھر وہ اپنی چھٹی اپنے مگر لایا۔ سو سینے دن بعد اس نے جینی قحی کا نام اس کا رافہ کھانکھا اور وہ گرم کھاتا تاج بدن والی صورت ایک سو چھاسو یں برس میں اپنی قحی ہوئی کھال اور کسی بھوی کھس کے ساتھ اٹھ کر جاری ہوئی۔

اہلک کے بیٹے بتا رہی تھی رافہ سے ملے پھر بڑے کو یوں کی من ہی پر ہوئی قحی۔ اور رافہ کھم کے خوشی کے ساتھ شاداب اور میہ کے کوئی کی مثال نرم اور چلی گئی۔ گات خوب اور خوشنما اور سیدھے سچی دودھ میں گوندھے میہ کے دودھ سے۔ تو بتا کرنے بڑے کو یوں کی من پر اسے تاکا اور پانی کے پھلکے ڈال کی طرح اسے کھینکا اور سیراب ہوا۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ وہ کو یوں پر گیا اور اس نے رافہ کو ہانہ نہ پالیا۔ جب رافہ کو وضو نہ پاؤں نہ تھاس کے مگر تک گیا اور وہ یہ کچ کر حیران ہوا کہ رافہ کے مگر کی اوجی اوجی ہو گئی اور اس میں دروازہ لگ گیا ہے۔ اور اس سستی میں یہ پہلی قحی اوجی قحی جو اوجی ہوئی اور پہلا دروازہ تھا جو کھتا ہوا۔ بتا کرنے اس دروازے کو کھینکا یا پر وہ دروازہ نہ کھلا۔ بتا کرنے رافہ کو پکارا اور جواب نہ پالیا اور بتا کرنے دروازہ کھینکا یا اور رافہ کو پکارا کہ اسے جات پھینکے والی کی جینی اپنی بھاری پوشاک سے نکل اور بند دروازہ کھول اور مجھ سے مل۔ پر دروازہ بند رہا اور پکارا کہ جواب نہ آیا اور بتا کرنے پھر دروازہ کھینکا یا اور پھر رافہ کو پکارا کہ اسے صرت تو جو آٹا رام میں ہے آٹا رام کی آواز سن اور دروازہ سے آہیز آس سے پہلے کہ لوگوں کا موسم نہر جائے اور ہم کھل سینے سے رو جائیں اس سے پہلے کہ کھم کی پائیں سوکا کر مرخ ہو جائیں اور ہم فصل کاٹے سے رو جائیں۔

بتا کرنے رافہ کا دروازہ بہت کھینکا یا اور رافہ کو بہت پکارا پر وہ دروازہ نہ کھلا نہ اس پکار کا جواب آیا۔ جب وہ بائیں مگر لوٹا اور در سے کہا کہ میری چھٹی مجھ سے دور ہوگی اور گوشت جانیں سے جدا ہو گیا۔

اہلک نے بتا کر کے اندھہ کو دیکھا اور کہا کہ اسے مرے بیٹے میں قحی ہے تو کہتا ہوں جو میرے باپ نے مجھ سے کہا۔ اور میرے باپ نے مجھ سے وہ کہا جس کے باپ نے اس سے کہا۔ جو جن میں سے ہے وہ ان کے ساتھ اٹھا جائے گا جو صرت جس غیر سے ملتی ہے اس غیر میں دامن جائے گی۔

بتا کرنے اس قول کو نہ مانا اور کہہ کر اسے کہا کہ میں رافہ سے ایسے الگ ہوا جیسے کھم کے دانے سے کھم کا پھلکے الگ ہوتا ہے۔ جب اہلک نے اس سے کہا کہ اسے مرے بیٹے میں قحی ہے تو کہتا ہوں جو سلیمان حکم نے اپنے فرزند سے کہا کہ کھیل صرت اگر بچان نہ کی ہو تو سوز کے تختوں میں پڑی ہوئی سونے کی تخت ہے۔

تھیر بیٹے نے اپنے باپ سے کہا کہ صحت موت کی مانند دور آ رہا ہے اور مگر سے نکل گیا بتا کر مگر سے نکل کر رافہ کے دروازے پر گیا پھر اسے بند پکا کہ اس نے پھار کا دروازہ مگر سے عقب میں گیا پر وہ یہ کچ کر حیران ہوا کہ اب رافہ کے مگر کی دوج اوجی ہو گئی ہے اور اس نے اندھہ سے کہا کہ اوکھا ہو کھم کے دانے پر جو میرے اور رافہ کے درمیان دوج ارتن گیا۔

اور اس ہوا کہ جب زمران کے گھر کا دروازہ بین گیا اور اس میں کٹری گنگئی تو کچھ دیکھنے والوں نے اسے دیکھ کر رعب کھایا اور کچھ دیکھنے والوں نے اسے دیکھ کر اس کے پیچھے کی چیزوں کے بارے میں تجسس کیا۔ پھر ایک دن اس ہوا کہ زمران کی بھاری پوشاک چوری ہوئی اور یہ پہلی چوری تھی کہ اس ہستی میں ہوئی۔ پہلے اس تھا کہ سونے کی ڈالی باز اس میں پھینک جاؤ اور دوسرے دن آ کر اٹھانو گھرب لوگوں نے اپنی اپنی چیزیں منگوا کر رکھنی شروع کیں اور ایک آڑی نے زمران کی پوشاک چوری ہو جانے کے بعد زمران سے کہا کہ میرا گھر خیر محفوظ ہے۔ کہا میں دروازہ ہٹاؤں۔ زمران نے کہا ہٹاؤں گے اور اس نے دروازہ ہٹا لیا۔ پھر دوسرے آڑی نے اجازت لی اور دروازہ ہٹا لیا پھر تیسرے آڑی نے اجازت لی اور دروازہ ہٹا لیا اور پھر چوتھی نے دروازے سے پتے چلے گئے۔ زمران نے اپنی پوشاک کی چوری کے بعد اپنی دوجاریں اونچی کر لیں۔ پھر جب اس کے آڑیوں نے دروازے سے غواہے تو انہوں نے بھی اپنی اپنی دوجاریں اونچی کیں۔ ان کی اونچی دوجاریں کو دیکھ کر زمران نے اپنی دوجاریں کو اور اونچا کر لیا۔ جانتا چاہئے کہ بلی کی بڑھتری کی ایک حد ہے پر دجاریں کے اونچا ہونے کی کوئی حد نہیں ہے۔

زمران نے پہلے اپنی دوجاریں اونچی کر لیں اور دروازہ ہٹا لیا۔ پھر اس نے اپنی دوجاریں اونچی کیں اور دروازے کو مضبوط کیا۔ پھر اس نے دروازے پر گھبھان بٹھائے۔ پھر اس نے سواری بخوائی کہ دروازے سے نکل کر اس میں بیٹھا اور باہر جاتا۔ پھر اس نے سواری کے لئے شہرہ بخوائی کہ ہستی کے گرد گرد گھیل کر اور زمران کی دوسری گھڑیوں سے جتنی ہوئی سواری اس پر ہوا کی مثال چلتی۔ پرائے ملک نے زمران سے یہ کہا کہ میں تیرے باپ سے اور تیرے باپ نے اپنے باپ سے یہ سنا کہ جب سواری آ جاتی ہے تو مردوں کی ٹانگوں کا زور دھت جاتا ہے اور جب شہرہ نہ جاتی ہے تو زمین تلک ہو جاتی ہے اور کھٹے دروازے ہوتے ہیں۔

جب دروازے سے تین گھنٹے اور دوجاریں اونچی ہو گئیں اور زمران کے دروازے پر گھبھان بٹھ گئے اور دوجاریں کے آگے سواری آ کھڑی ہوئی اور دوسری گھڑیاں جھپٹنے لگیں تو تیسوں پر اسرار طرہ پر قہقہہ ہانپنے لگا اور بھوک بڑھنے لگی۔ اب زمران کے آنے کی بھڑی لوگوں میں تقسیم ہوتی ہوئی تھی کہ یہ بھڑی اب اسی کو دوڑھیا گھڑیاں کھاتی تھیں۔ جب بھڑی کی تقسیم بند ہوئی تو لوگوں نے اپنے اپنے حصے سے آئے ہوئے آنے کو قہقہہ ہانپنا اور بھوکا ہانپنے لگا لگا لگا۔ اور زمران کے آڑیوں نے جب آئے آنے کو قہقہہ ہانپتے دیکھا تو اپنے دروازوں کو کھستہ جاتا۔ اور آکھو کا دھیمان کر دھت مگر میں تنگ کیا اور دروازہ نہ نہ کر لیا۔ تب ہستی میں آتا اور قہقہہ ہانپا۔ اور اٹھنے لگا۔ اس نے اس انداز سے کہ سہارا اس کی بھوک بڑھ جائے۔ گھبھان کا آواز نہ پا کر جو خیر سے اور انہیں بھلیں کر دینی چاہتی اور بھٹ بھرا۔ اور اس وقت کو یاد کر رہا کہ میں نے یہ کہا کہ اس نے یہ جانتا اور اس میں سے جو کچھ چھپا رکھی ہے چاہے کھانا ہی۔ پھر کھانوں نے اسے جو ان سے کہا تھا قبول کر لیا۔ چھ دوسری بات رکھ دی۔

اٹھنے لگا جو کی روٹی کھا کر گھر سے نکلا اور زمران کی گھڑیوں کو بھڑی کا رعب کھاتے دیکھ کر حسرت سے بولا کہ جو رزق میرے حصے کا تھا وہ زمران کی گھڑیوں کے پیٹ میں چلا گیا۔ زمران نے اس کا یکایک منہ سنا اور کہا کہ اسے اٹھنے کو ہم میں سے ہے۔ سو تو ہمارے ساتھ دسڑھوان پر بیٹھو ہمارے ساتھ روٹی توڑو۔ اس پر اٹھنے کے کالوں پر ہاتھ رکھے اور کہا کہ میں پتا مانگا ہوں اس دن سے جب گھبھان کو گھبھان کے چھلکے سے جدا کر کے کھائوں اور کھانوں میں شام کیا جاؤں۔

زمران نے اٹھنے کے جواب کا برائیاں۔ اس نے اٹھنے کے سر پر فہر میں ڈھانکارا اور کہا کہ تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے۔ کیا تو مجھے خاتمے کا۔ سو تو ہمارے درمیان سے چلا جا اور یا کدو اس وقت کو جب ہم نے تم سے یہ یہ ہمدیا تھا کہ کچھ میں غور ہی کرتا اور راتوں کی اپنے ملک سے مت نکلتا۔ پھر تم نے اقرار کیا اور تم اس کے گواہ ہو۔ پھر وہی تم ہو کہ راتوں کو کھل کر تے ہوا اور اپنے سے ایک کروڑ کو اپنے ملک سے نکالے ہو اور ان کے برعکاف لگاؤ اور دانی کر کے میں ایک دوسرے کی پشت چھائی کرتے ہو۔

اٹھنے اپنی زوجہ کو کھراوے لے جاتی ہے نکل گیا اور دور کے جنگل میں جا کر ڈیرہ ڈالا۔ یہاں وہ بہت دنوں اپنی اکیلی جان کے ساتھ تاد رختوں اور سخت زمین سے لڑتا رہا۔ جب سواری پر ساتواں سال کا تو وہ تھک گیا اور مرنے کے قریب ہوا۔ اس کی زوجہ نے وہ کر کہا کہ کیا تو مجھے اس دیرانے میں اکیلا چھوڑ کر جائے گا۔ اٹھنے نے آکھیں کھلیں اور کہا میں آئے دن لوگوں کا انتکار کروں گا۔

پھر اس ہوا کہ اس بات کے تیسرے دن ایک ظفر اب دھت وہاں پہنچا اور اٹھنے سے پتا کا خطاب ہوا۔ اٹھنے نے انہیں پتاؤں اور یہ چھپا کر اسے دوست کو کھرتے آتا ہوا۔ انہوں نے کہا کہ ہم زمران کی ہستی سے آئے ہیں۔ میں کہ اٹھنے کی زوجہ نے سوال کیا کہ میرے بیٹے بخاؤ کے بارے میں کچھ کہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ تیرا بیٹا اپنی آگ کا چھڑھن بن گیا اس نے رافہ کے لئے زمران کی دوجاریں پر عقب سے کھڈائی اور زمران کے آڑیوں سے آگے نکل گیا۔ تب وہ اس اونچی دوجاریں پر کھڑا ہوا اور نیچے کو پڑا خدا تیرے بیٹے پر اپنی رحمت کرے یہ ہماری ہستی کی پہلی اونچی دوجاریں پر پہلی کھڈی اور مٹش کی پہلی ادا رات تھی۔

اٹھنے کی زوجہ پر یزیرن کر اپنے بیٹے پر دو ہتھڑی اور اٹھنے کا سر جھک گیا اور اس نے یہ کہا کہ بے شک عشق موت کی مانند زور آ رہے۔ ہر روز کا زور اپنے گریبان پر پٹنگا اور جو صورت جس شہر سے آئی ہے اس شہر میں داخل ہو جائے گی۔

یہ کہ اٹھنے کے فہرہ سانس بھرا آکھیں بند کیں اور چپ ہو گیا۔ پھر کہا کہ دوسروں کی کہو۔

ظفر والوں نے کہا کہ دوسروں کی موت چھ۔ دوجاریں کے گرد مگر ہاتھ اس سے اچھا ہے کہ آدمی قاتل کے کمرے۔ کھیت شہر رہوں اور سفیلوں کی زمین آگے۔ کھیتوں والے بنے کچھ سائیس ہوئے کچھ آوارہ ہو گئے۔ اور گھبھان ہمارے درمیان

تھوڑا رو کیا اور کس ہو گیا اور ہم نے زمران کو اپنے آپ پر ٹھک پایا اور نکل کھڑے ہوئے کہ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔

اللہ ملک نے اس پر یہ کہا کہ اللہ کی زمین بے شک بہت وسیع ہے پر اللہ کے بندوں پر وہ ہمیشہ نیک رہی۔ یہ کہہ کر اس نے آنکھ بند کر لی اور ہمیشہ کے لئے چپ ہو گیا۔

قاضی دادوں نے اللہ ملک کو عزت سے دفن کیا اور اللہ ملک کی بیوہ کو عزت سے اپنے درمیان جگہ دی کہ اللہ ملک نے ان کے لئے اس عظمت زمین کو بہت نرم کیا تھا اور اچھے درختوں کو بہت سرگرم کیا تھا۔ پھر وہ خود رخت زمین اور تناور درختوں کی زیر کمرش میں مصروف ہو گئے۔ پھر عین ہوا کہ تھوڑے دنوں بعد زمران کی بستی سے ایک اور قافلہ چلا اور بھوکا یہاں پہنچا۔ زمران کی بستی میں تھا چڑ گیا تھا اور وہاں سے پہلے ایک قافلہ چلا اور یہاں آ کر پناہ گیر ہوا۔ پھر دوسرا قافلہ آیا اور پناہ گیر ہوا پھر قافلے آتے چلے گئے اور یہاں ڈیرے ڈالتے چلے گئے سب کے آخر میں وہ قافلہ آیا۔ جس کا بزرگ سب کے بچے بچہ کو سب کا بزرگ بنادیا اور منصف نمبر اوہ بزرگ یہاں ان جانوں پہنچا تھا کہ اس کے پاس کچھ ساز و سامان نہ تھا۔ با سوا ایک آنے کی چمچلی کے۔ اور یہ پٹلی آنے کی چمچلی تھی جو اس بستی میں پہنچی۔



دوسرا راستہ

میر انصاف امین مسلمان حکومت کے پیچھے جھوٹا کرنا۔ وہ بہت پکڑا ہوا۔ یہ کہنا خواہ وہ ہے مگر کہتے پر تو یہی کچھ لکھا ہوا تھا۔

اس وقت وہ ڈیل ڈیکری بالائی منزل میں درپے کے برابر کی نشست پر بیٹھا تھا اور باہر دیکھ رہا تھا۔ سڑ میں "خواہ وہ بس کا سفر ہو یا لاری کا یا ریل گاڑی کا" اس نے ہمیشہ درپے کے برابر وضعت پسند کیا کہ یوں آدمی اندر کے اچھے برے لوگوں کے ہجوم کا حصہ بننے سے بچا جاتا ہے اور باہر کے تیزی سے بدلتے ہوئے منظر سے رشتہ استوار کر لیتا ہے۔ وہ جب جب سڑ میں درپے سے دور بیٹھا یہ سمجھا کہ وہ ہجوم کے نرے میں ہے اور ہجوم کا حصہ بن گیا ہے مگر آج ڈیل ڈیکری بالائی منزل کی نشستیں اچھی خاصی تعداد میں خالی پڑی تھیں۔ اسے تھوڑا تعجب ہوا کہ بس اتنی دیر کے بعد آئی ہے۔ پھر بھی ایسا دانش نہیں ہے مگر اس نے درپے کے برابر بیٹھ کر باہر دیکھنا شروع کر دیا اور جلدی اندر کے منظر سے بے خبر ہو گیا۔ اگر ظفر اس کے ساتھ نہ بیٹھا ہوتا تو وہ شاید اندر کے منظر سے مکمل بے تعلقی پیدا کر لیتا ہے مگر ظفر نے پیٹھے پیٹھا سے پھر لہو کا۔ "اتھارو دیکھو ہے وہ؟"

اس نے باہر دیکھنے دیکھنے اندر اپنے سے اگلی نشست پر نظر اٹلی جس کی طرف ظفر نے اشارہ کیا تھا اسے تو پتہ چل نہیں تھا مانے وہ آدمی کس وقت آ بیٹھا تھا ہاتھ میں لمبی سی چھڑی چھڑی سے لگی ہوئی تھی کی تختی تختی پر لکھا ہوا۔ "میر انصاف امین۔ مسلمان حکومت کے پیچھے جھوٹا کرنا۔" دونوں نے کتبہ پڑھا پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرائے۔

اب بس کی سب نشستیں پر ہو چکی تھیں۔ کچھ کچھ لوگ توڑنے کے قریب انڈا پکڑے کھڑے تھے۔ رفتہ رفتہ کتبہ سے بے تعلقی ہو کر وہ پھر باہر دیکھنے لگا تھا کہ کپا تک کتبے والے آدمی نے جہر جہری لی اور کھڑا ہو گیا۔ اس طرف سے اس طرف تک اس کو نے سے آخری نشست تک پہنچے ہوئے لوگوں کو دیکھا کھٹکھٹا اور شروع ہو گیا۔

حرم کی صفی کبھی نہیں
ہو کاغذ کی کبھی نہیں
میں صفی نہیں

اسے میرے مسلمان بھائی۔ عرصہ گزر گیا ہے انصاف ابھی۔ انصاف احتساب یاد کرو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے

صاحب جب واقعہ ہے۔ کل میری ایک مرفی نے ایک ایک مریغ کی طرح بازو پھنپھنائے گردن پھلائی اور ہانک دیتی شروع کردی۔

”جگ والے آدی نے چنگ کر پوچھا ”مرفی نے؟“

”کیا مرفی نے۔ میں نے فی الفور اس کی گردن پر چھری پھیر دی۔“

”حیرت کی بات ہے۔“ جگ والا بولا جیسے اچھے نہیں آ رہا۔

”حیرت کی بات بھی ہے اور شوش کی بھی۔ اظہام سب پر دم کرتے ”انجکشن“ میں نے غصہ سانس بھر اور چپ ہو گیا۔

جنگ والے آدی نے ایک ہار مگر مزید کیا۔ غور سے انجکشن پر نظر کی اور ایک دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ نظریں پھیرتے ہوئے اپنے رخ دیکھنے لگا۔

انجکشن کو جنگ والے آدی کا سکہا، کچھ بھانپا نہیں۔ ”کیوں جناب آپ ان باتوں کو نہیں مانتے؟“

”نہیں؟“

آپ مت ناخوش مگر ایسا ہوتا ہے۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں ہمارے تاجا جان کی ایک غلطی اس جس۔ وہ دلی کی جس۔ کہا کرتی جس کے رکھنے سے رمضان کے رمضان کے خواجہ جعفر مسجد جایا کرتے تھے۔ اس برس بھی گئے مگر ایک شام کو کیا ہوا کہ خواجہ قلعہ سے باہر نکلتے تھے کہ ان کے طرف سے چھٹیل منڈ لاتی آئیں ایسا جھینڈا رکاز خون اوندھے ہو گئے۔ کسی کی جھک میں نہ آیا کہ یہ ہوا کیا۔ اس شام بعد مسجد میں افطار دی تھی نہیں ہوئی۔ اسی رمضان میں میرے پہلے پہلے دلی میں قیامت برپا ہوئی۔ جگر ندر چکا گیا۔ جگر کال پڑا ایسا کال..... میں یہ کھوکھو کھڑے بدست کال پڑا تھا۔“

”آڈی تو جہ سے سنا رہا پھر کہنے کا۔“ ہاں عزیز یا اشارات نہیں ہوتے ہیں۔ قدرت رزق چھینے سے پہلے کسی نہ کسی رنگ کا اشارہ ضرور کرتی ہے۔ آپ کی کچھ یاد نہ کیجئے۔“

جگ والے آدی نے جھرجھری لی۔ ”جناب آپ کی اس بات پر مجھے اپنا ایک خواب یاد آ گیا۔ جیسے اپنے من میں جیڑا کھا کھا رہا ہوں۔ قہقہے میں وہ نظریں دگنی ہیں۔ آپ کو جھین نہیں آئے گا بیٹھواری پر اچھے سے بڑی روٹیاں اور دلی میں جیسے میرے کی ہوں اور دلی کی نرم جیسے لوچاں۔ اسے میں ایک مونا سا بنا رہا ہوں۔ میرے سامنے سے ساری روٹیاں اٹھا تا ہے اور یہ جاوہ چا۔“

انجکشن میں نے کچھ ”جگ“ کچھ افسوس سے پوچھا ”ساری روٹیاں؟“

”کی ساری روٹیاں۔“ جنگ والے نے تانسف بھرے لہجہ میں کہا۔ ”کوئی روٹی نہیں چھوڑی۔ قہقہے خالی..... اور جناب آپ کو شاید بات ہے جیسے ہی نظر آئے مگر یہ واقعہ ہے کہ اس بعد میں چوٹا نہیں۔ کاروبار پٹ ہو گیا۔ سارا ۱۵۱۵ غارت ہو گیا۔ یہ لوہے آگ کی کر مڑا بھی چک گئی۔ اب میں بس میں سڑکا ہوں۔“

”آڈی نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔“ یہ خواب تم نے کب دیکھا تھا؟“

”کوئی دن بارہ برس پہلے کی بات ہے۔ شاید اس سے بھی پہلے کی۔ یا شاید اس کے بعد کی۔“

”صدقہ دیا تھا؟“

”نہیں۔“

”دے دینا چاہتا تھا۔“

”آڈی کا لہجہ توشہ کھاتا تھا۔ جنگ والے شخص نے اس آدی کی تشریح بھری صورت دیکھی اور سوچ میں پڑ گیا۔ انجکشن پر غور سے سب کچھ سن رہا تھا۔ ”بھائی جان شاید آپ اس بات کو مبالغہ نہیں مگر اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے۔ ایسی روٹی جو آپ بیان کر رہے ہیں ہم نے کچھ نہیں سچ چکا کھائی ہے۔ مگر بھائی اب نہ دینا کیوں نہ دلی روٹی۔“

”شخص افسردہ لہجہ میں کہنے لگا۔“ صاحب خدا کی قدرت ہے۔ ہم ہی نے وہ زمانہ بھی گزارا ہے جب ایک روپے کے گھوٹوں کے لئے حوروں کو رچا تھا اور حوروں کو رچا تھا۔ آئے آئے پینے میں شراب ہو رہا تھا۔ ہم ہی یہ زمانہ کچھ رہے ہیں کہ روپے کا آٹا خدا جوت نہ بناوے غمی میں آ جاتا ہے۔“

بسی کی رفتار ہانک بہت تیز ہو گئی۔ اس نے در پیچے سے باہر دیکھتے دیکھتے بہت جلد ہو کر غصہ کو دیکھا۔ ”یار غلہ مارے گئے۔“

”کیوں کیا بات ہے؟“

”گناہ ہے کہ کوئی جلوس ہے۔“

کھنکھارنے لگا۔ ”اطمان کیا۔“ ”پاشا ڈاٹے اپنے سر اندر کر لیں۔“

جو آدی گردن نکالے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس نے گردن اندر کر لی۔ سب اس طرح سکوت گئے جیسے وہ چلی بن گئے ہیں۔ جنگ والا آدی ہنوز سر نکالے باہر دیکھ رہا تھا۔ شخص نے حیرت سے کہا۔ ”عزیز سر اندر کر لو۔ اسے سر دیکھ کر آتی ہے۔“

بیک والے آدمی نے قدر سے توقف کے بعد بغیر کسی گلت کے آہستہ سے سرائر کر لیا جیسے کسی کے کہنے پر نہیں بلکہ اپنے طور پر اس نے یہ اقدام کیا ہے۔

اس کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔ اگر اینٹ میری طرف آئی تو؟ اس نے صور حال کا جائزہ لیا۔ دوپٹے کے برابر میں بیٹھا ہوں۔ نظری میری اوٹ میں ہے۔ تو گویا میں اینٹ کی زد میں ہوں۔ میں نے ہی بیٹھے میں گلت کی۔ جیسے ہم دونوں اس میں چڑھے تھے مجھے چاہئے تھا کہ قزوے دی ٹھٹھ سے کام لیتا۔ اس صورت میں قنارہ دوپٹے کے برابر ہوتا اور میں اس کی اوٹ میں ہوتا۔ اب میں دوپٹے کے قریب قریب ہوں اور اینٹ کی زد میں ہوں۔ اور اینٹ نہ بھی لگے۔ یہ کینٹ شیئر جب نوٹ کر بکھرے گا تو غلام غلام کروے گا۔

”ہاشا سرائر کر کر۔ اسے بھائی ٹولی والے ہاؤس سرائر۔“ کزنیکس نے ہچکلی نشست پر کسی کو باہر بھاگتے دیکھا تھا اور تجسس کر رہا تھا۔

اس نے جھرمجری لی ”یا نظری جب یہ بات ہے۔“

”کیا؟“

”وہی زمانہ اس آگیا۔“

”کون سا؟“

”ہماری پچیس رات کے وقت شرقی بھاب سے مڑی تھی۔ میں رات بھر سرے میں بیٹھا۔ ایک دفعہ دھماکا جھانکی تھی کہ اسیے دھماکے نے صور بچا۔ دھماکا بھانڈا زور دینی پر گولی آئی ہے۔“

”اعتیاد بھانڈا کڑا“ نظری نے کسی قدر تنبیہ کی کہ ساتھ کیا۔ ”دو دفعہ اور تھا یہ قصہ اور ہے۔“

”کیسے؟“

”دو ہندو مسلمان کا قصہ تھا۔“

”اور؟“

”یہ پیدل سوار کا قصہ ہے۔“

”میں نہیں سمجھتا۔“

”سیدھی صاف بات ہے۔ اس وقت ہم بس میں سوار ہیں اور پلائی منزل میں بیٹھے ہیں اس لئے اینٹ کی زد میں ہیں۔“

اس نے سوچا پھر کیا۔ ”اگر میں اگلے بس سٹاپ پر اتار ہاؤں پھر؟“

”پھر تم بھی اینٹ مارنے والوں میں ہو گے۔“

”ہرگز نہیں۔“

”تو پھر تھانیاں میں ہو گے۔“

وہ اس بات کا جواب دینے لگا تھا کہ بس دفعتاً رک گئی۔ وہ چمکا۔ ”کیا بات ہوئی؟ بس رگ گئی۔“

”کوئی سٹاپ ہو گا ظہر ہوا۔“

”جب اپنے رات ہی پر نہیں چل رہی ہے تو سٹاپ پر رکنے کا کیا سوال ہے اور یہ کہتے ہیں اس نے دوپٹے سے ہوری گردن نکال کر مجھے دیکھا۔ شاید سٹاپ ہی تھا یا شاید کوئی سٹاپ نہیں تھا۔ ایک شخص دھوٹی باندھے میلا سا کرتا پہنے زور زور سے سیریاں چڑھتا آیا اور قریب کی نشست پر بیٹھ گیا بیٹھ کر ہوا۔ ”ہاؤں کونسا نمبر ہے؟“

ظہر نے اسے دیکھا اور کہا۔ ”جب یہ بس چلی تھی تب تو اس کا ایک ہی نمبر تھا اور وہ جس معلوم تھا۔ اب پتہ نہیں کہ اس کا کیا نمبر ہے۔“

وہ شخص اس جواب سے کچھ پکرا یا۔ ”کا پھر سیدھا سوال کیا“ باقیابارہ سے جانے گی؟ ”اب یہ بس کسی بھی رخ جا سکتی ہے“ ظہر کہنے لگا۔ ”ہوسکتا ہے یہ باقیابارہ سے ہی کی طرف چل جائے۔“

وہ شخص اس جواب سے کچھ ٹھٹھ میں پڑ گیا۔ کچھ سوچی کر اپنا ایک اٹھ کھڑا ہوا اور میں اس وقت جب کزنیکس کی جلی جلی تھی وہ تیزی سے سیریاں اتر گیا۔

”یا نظری اسے بھی اب یہ بتائی ہوئے گی۔“ ہم آہن شیشیں ہتھی جائیں گے۔“

”کیوں نہ کہیں تو پیچھے گے۔“

ظہر کی یہ بات اس نے سنی اور جواب دینے بغیر کسی قدر فکر کے ساتھ دوپٹے سے باہر بھاگنے لگا۔ ”پتہ نہیں بس کس راستے سے جا رہی ہے۔ کوئی بہت سی آواز تھاروت اختیار کیا ہے۔“ ”کا پھر ہوا“ مجھے تو ابھی لگ رہا ہے کہ اس وقت اس بس کی کوئی سٹ نہیں ہے۔ بس اٹھوا حد چلے جا رہی ہے۔“

مفتاح نے یہ فقرہ سن کر کسی قدر بے چارگی کے ساتھ کہا۔ "آج تو ہم اراکھ کے قہر و کرم پر ہیں۔"

ٹینک والے نے تھوڑی دیر ہی سے کہا۔ ڈرائیور کو کوئی نہایت لفظ قسم کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔“

”اے صاحب میں اس ڈرامہ کو جانتا ہوں۔“ انہیں پائل نے اپنی واقعیت عامر کا حجت بروقت فراہم کیا۔ ”یہ ڈرامہ رکلی مائے گرجہ کا ہے۔ کمال ہے اس کا رسوا ہر یوں کی پڈ پٹاں پسلیاں تو ۱۹۵۱ء سے۔ خود صاف ہی ۱۹۵۱ء ہے۔“

شوہر نے لفظ اسانس بھرا "لفظ اسانس سے اسانس بنے۔"

میک دالے نے پھر اپنی برہمی کا اظہار کیا۔ "بہت سی پھیر دے کر لئے جا رہا ہے۔"

”اچکن پاش (لا)۔ ”اماں“ پھیرے بھی جائیں تو قیمت سمجھنا۔“

ایک ایک والا ہوا۔ ”رستہ تو سیدھا تھا۔ بجائے اس طرف آنے کے حرمک چوگی سے چل روڈ پر عزمانی۔ چل روڈ سے ریس کورس روڈ، ریس کورس روڈ سے لال روڈ، لال روڈ سے گل روڈ، گل روڈ سے سیدھی سٹیشن۔

ہنگ اے آدمی نے ٹینگ اے کو غور سے دیکھا پھر کہا: "ہاں صاحب! سید محمد سے اس وقت سب بند ہیں۔"

”نقہ لے ارد گرد دیکھا“ کٹھ پکڑ کہاں گیا۔“

”کنڈ پکڑ کر گولی مار دوئی“ انہیں گش فٹ سے بولا۔ ”جیسے جاکے دیکھتا چاہئے کہ ڈرائیو رہی ہے یا نہیں، مجھے تو یوں لگتا ہے کہ کسی اس وقت بغیر ڈرائیو کے چل رہی ہے۔“

تھے دالے نے اپنا تکبیر بھری لی۔ کھڑا ہوا اور شروع ہو گیا۔ ”مجھے اپنے مسلمان بھائی کی بات سن کر افسوس ہوا۔ جس کا چاہنا
 بطور ذرا بخیر کے نام ممکن۔ یہ کٹر کٹر ہے۔ مسلمانوں کو کٹر کٹر ہے اگر ذرا کٹر شاعرے کا خوب کہا ہے کہ۔“

۱۲۔ کا ہے کہ ہے اختیار ہے ہے

مگر شاعر نے یہ بات کہاں سے لی۔ ایسا انکس اے کو کو نام ایسے اوکھنوں پر سوار ہو جن کی باتیں کہارے ہاقصوں میں نہیں۔ سوار اوکھن دوں سوار سے ہیں اور چلے رہے ہیں بے سمت بے منزل۔ مگر مسلمان حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تو جس سو سکتے تھے۔ کیونکہ اوکھن کی چوڑی گلی تھی مجھے اپنے مسلمان بھائی کی بات سن کر بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھے ہونے آئے کی روٹی کچھ کر کیوں روئے ہاں کیوں روئے۔ میرا جواب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

فیضانِ رضا کے دستِ سخاوت پر رکھی ہوئی کہلوی کی روٹی۔ پھر کیا ہوا؟ صدیاں گزریں انصاف مانگتے۔ انصاف نہیں ملا۔ مجھے حضرت مراد علی صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد۔ آج ہم کوھر جا رہے ہیں۔ ”یہ میرا سوال ہے مجھے جواب دو۔ سات پیسے کا کارڈ لکھ کر کیونکہ ذاتی بحث میں جھگڑے کا ذریعہ اور فساد پیش ہے از روئے اسطلاح مجھے ہونے آنے کی روٹی کہلوی کی روٹی“ مان جو ہیں۔ حضرت مراد فدا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کرتا اور فرما نا اس جناب کا کہ کاش ایران اور عرب کے درمیان آگ کا پھیلاڑ مائل ہوتا۔ اور لگوے لگوے کرتا۔ ایرانی قاتلین کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا کہنا کہ ان کو تاری تسماری جہادی جا میں ان پر سے آگ کا جینا ہم میں قسم میں باقی ہیں۔ مگر جب حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ داخل ہونے والا ملاقات میں تو روئے دیکھ کر دینا دھر کیوں؟ جواب دو مجھے سات پیسے کا کارڈ لکھ کر ذاتی بحث.....“

سننے سننے، "کسمپا" غصہ پڑا اس شخص کی باتوں میں قصہیں کوئی رہا نظر آتا ہے؟"

”رہا آج کل کی باتوں میں نظر آتا ہے۔“ نظر کا پردہ اُٹا ہے جو کہ ہر گھبراہٹی جھلکی ہی دلچسپی کے ساتھ سنبھالنے والے آدمی کی تحریر ہے۔

”ہاں سات مہینے کا کارڈ لکھ کر کرنا پڑی، بحث میں مجھ سے کارڈ ہے اور فساد منع ہے۔ ان دنوں اسلام۔ جہالت کا عمل اور ظلم کا عمل
کا.....“

ٹھوٹھوں نے کہا اپنی ہی سوچی میں گم تھا ہاں ایک بگ والے آدمی کو مخاطب کیا۔ ”میرے عزیز! ایک بات بتاؤ۔“

”جی فرمائیے۔“ جگ والہ آدمی ایک ساتھ صوبہ ہو بیٹھا۔

”کچھ یاد ہے کہ وہ دن کونسا تھا؟“

”دکن؟ کون سا دکن؟“ جگہ والا پوچھا۔

”جب تم نے خواب دیکھا تھا۔“

”اچھا باب ٹواب دیکھا تھا۔ سوچا سوچی کر بولا ”صاحب یہ تو اب مجھے یاد نہیں۔“

 $^{10}\text{C} \rightarrow ^{10}\text{B} + e^- + \bar{\nu}_e$

”نہیں صاحب۔ خاصہ عرصہ ہو گیا اس بات کو۔ اتنا یاد ہے کہ وہ بہت موٹا باندہ تھا۔ میں کہہ گیا۔ اس نے ساری روئیاں نکلتیں اور صاحب۔ چلمیری آنکھ کھل گئی۔“

اس نے باری باری سب چروں کو دیکھا۔ چرسے دلتا جب سے ہو گئے تھے۔ جیسے انہیں کسی بڑے خوف نے آ لیا ہو۔ بس ایک شور کے ساتھ وہ بڑے چل چار ہی تھی۔ اور اب اسے احساس ہوا کہ بس چلنے ہوئے کتنا شور کرتی ہے۔ اس وقت اس کی خواہش تھی کہ بس کی رفتار دیکھی ہو جائے۔ اس کی تیز پر شور دلتا اسے خود کو اداوار ہی تھی۔ پھر اسے اس ڈبل ڈیکر کتیاں آ یا جو ابھی مقابل سے آتی ہوئی برابر سے گزری تھی۔ کیا واقعی اس کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے؟ اصل میں ڈبل ڈیکر جب گزری تھی وہ اندر چلک والے آدی کو کچھ پر ہاتھ اور جہر ہاتھ آ کر آتی تھی کسی کی کوئی بات ہوئی جو وہیں فٹے جا رہا ہے۔ گزرتی ہوئی بس پر اس کی نظر ضرور پڑی تھی کچھ گھنٹی کی گھر۔ اگر اس بس کے شیشے واقعی ٹوٹے ہوئے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آگے اور پھر سوچتے سوچتے اس نے ایک بار پھر بڑی بے لگنی سے اپنی صورت حال کا جائزہ لیا۔ میں تو درہجے کے برابر بیٹھا ہوں۔ بالکل اینٹ کی زد میں ہوں۔

”مسلمانوں! مسلمانو! جیسے میرا سوال یاد نہ رہے۔“ کہتے والا آدی پھر شروع ہو گیا تھا۔ ”مہادھم نے میرا سوال اخباروں میں نہ پڑھا ہو کیونکہ اخباروں والوں نے یہاں کوئی اخبار والا آدی ہو تو مجھے صاف کر دے۔ اخبار والوں نے اسی روز بیرونواز جاسن کی تصویر پہلے سطر پر چھاپی مگر میرا سوال اندر کے اس صفحہ پر جہاں مذہب کے بھانڈے چھپتے ہیں۔ ضرورت رشتہ کے اشتہار کے نیچے شائع کیا۔ فاحشہ واپا آدی الا بھار۔ مگر اخبار والوں سے کوئی ٹک نہیں ہے۔ لگ بھگ وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں تو کوئی اخبار نہیں تھا۔ بس مسجد نبوی تھی۔ قریش نے اپنا سوال الگ چھپوا لیا ہے۔ آپ یہ اشتہار دیکھ کر غور سے پڑھیں۔“ یہ کہتے کہتے والے آدی نے اپنی نشست پر رکھا ہوا ایک جٹ کا قلعہ اٹھا اس میں سے اشتہاروں کا ایک پلندہ نکلا۔ ”تو اب اسلام میرا سوال غور سے پڑھیں اور سات پیسے کا کارڈ پر جواب لکھیں۔ کیونکہ زبانی بحث میں جھگڑے کا ڈر ہے اور“

ایک اینٹ اچانک اس کے اور قطر کے پیچھے والی سیٹ پر شیشے پر آ کر پڑی شیشہ ایک تیز شور کے ساتھ پھٹا چڑھ کر ٹکڑے ہو گیا اور اس نے ٹکڑی کی سرعت کے ساتھ اپنے آپ کو سمیت ”سرفٹری کر اور نشست کی پشت کے درمیان ٹھونس لیا۔ پھر اسے کچھ پتہ نہ رہا کہ کیا ہوا ہے۔ ہاں اس نے اسی طرح آنکھیں بند کئے فٹری کر اور نشست کی پشت کے درمیان منڈھونے ٹھونس کیا کہ بس ایک ہنگے کے ساتھ رک گئی ہے اور لوگ ایک ہنگے کے ساتھ ملے ہوئے بیڑیوں سے اتر رہے ہیں۔ لوگ ملے ہوئے اتر رہے تھے اور دل اس کا دھڑکھڑا رہا تھا۔ بس ٹھنک ٹھنک ہی اور وقت گئی۔

قطر نے اسے لہو کا اور اس نے سر اٹھایا جانے لگی دیر کے بعد مگر یہ کہ بس اب چل پڑی تھی۔ اس نے ارد گرد آدے پیچھے نظر ڈالی اس طرف سے اس طرف تک سب نشیمن خالی پڑی تھیں۔ اس کی نشست کے آس پاس شیشے کے کچھ بڑے بڑے ٹکڑے اور بہت

ی کہ چپاں بکھری پڑی تھیں۔ ہاں کہتے والا آدی اپنی نشست کا سہارا لے رہا تھا۔ اس کا کتہہ اس کے اشتہار چلے کر سے پڑے تھے۔ کہتے والا آدی جھکا احتیاط سے اشتہار پتورے انہیں درست کر کے چھیلے میں رکھا۔ پھر قلعہ نشست پر اپنے برابر رکھا اور کتہہ ہاتھ میں قائم خاموش بیٹھ گیا۔ اب پھر کتہہ اپنے چلی حروف کے ساتھ اس کے اور قطر کے بالقابل تھا ”میرا نصب امین مسلمان حکومت کے پیچھے جواہر کار ہے۔“

رفتہ رفتہ اس کا حوصلہ بحال ہوا اس نے پھر بار بار جھانک کر دیکھا۔ سڑک اور تنگ خالی پڑی تھی۔ کبھی بھٹا گزرتی ”شور کرتی“ رکشا کوئی مسٹ پٹ کرتا تیزی سے گزرتا پیدل آدی جا رہا بکھری ہوئی اینٹیں کہیں کھیں پڑے ہوئے ٹھٹھ شیشے ٹھٹھوں کے سامنے گزرتا ہوا سٹاپ سٹاپ ہے آدم سا مکان خالی نہ کوئی برقعہ ہاتھ عورت نہ کوئی اگھٹا ہوا بڑھا۔ سامنے ساری سڑک پر اینٹیں بکھری پڑی تھیں اور ایک کر کے ہونے پڑے سے سامنے کارڈ سے ہکا بکا حصاں اٹھ رہا تھا۔ اسے لگا کہ گاڑی کسی دروازے کے ویران مسمان نشیمن سے گز رہی ہے۔

”یار ظفر ہم نشیمن ہی کی طرف جا رہے ہیں؟“

”کچھ پتہ نہیں چل رہا۔“ اب قطر کے کچے میں بھی آتشیں کارنگ پید ہو چکا تھا۔ آگے نشست پر کہتے والا آدی بے حس و حرکت بیٹھا تھا اور اس کا کتہہ اسی طرح اپنے چلی حروف کے ساتھ اس کے اور قطر کے بالقابل تھا ”میرا نصب امین۔ مسلمان حکومت کے پیچھے جواہر کار ہے۔“

اس نے پھر قطر کو بلا۔ ”یار ظفر؟“

”ہوں“

”ہم سلامت گھل جائیں گے؟“

”ظفر سو فی میں پڑ گیا پھر لیے جا ل کے بعد بولا۔“ کیا کہا جا سکتا ہے۔“



بھر بھر کے لائے تھے۔ کچھ دھانے منہ پر باندھ کر اندر گھر سے دروازہ کا سامان اندھا دھند باہر پھینکتے گئے۔

"ارے بھائی حق صاحب کو بھی پتہ ہے یا نہیں؟" کسی نے پکا یک چلا کر کہا۔

"اے تو اس وقت پتہ چلے گا جب سب مل جائے گا۔" کسی نے صبر میں کہا۔

"اطلاع دے دینی چاہئے؟"

"اطلاع دینے کو نجان چاہئے گی۔" ہاں حالوں پر پتی ہوئی ہے۔"

پھر کسی طرف سے بھاگے بھاگے دوڑتے آئے۔ سڑک پر گئے ہوئے غل سے ٹھٹھکیں بھریں اور لپک چپک چلتی عمارت کے اندر گھس گئے۔

"ارے بھئی کسی نے فائر بریگیڈ والوں کو اطلاع دی ہے؟"

"پتہ نہیں کی۔"

"اطلاع نہیں ہے تو پھر جلدی دے دینی چاہئے۔"

"فائر بریگیڈ والوں کا فون نمبر کیا ہے؟"

"فون نمبر؟..... ارے بھئی کسی کو فائر بریگیڈ والوں کا فون نمبر معلوم ہے؟"

تیسری منزل والوں کو نے کا قہقہہ اب بالکل خصلوں اور دھوئیں کے نرے میں تھا۔ سامنے والی دیوار سے پلستر اتر گیا تھا۔ ایک دو جگہ اچھے خاصے سبائے کھل گئے تھے۔ اب وہ تھوڑا بہہ بچن ہوا۔ "آگ تو بڑی جلتی چلی جا رہی ہے۔"

مجھے بھی آتشیں ہوئی۔ "ہاں اب تو بہت بڑھ گئی ہے۔"

ہوا۔ "اصل میں میرے کمرے کی چھت زیادہ مضبوط نہیں ہے۔ پچھلی برسات میں بہت چٹکی چٹی۔" دکا۔ پھر آہستہ سے ہوا۔

"کبھی گرنہ پڑے۔" یہ کہتے کہتے میرا ہاتھ پکڑا۔ "چلو ہمیں۔" وہ دوار میں دونوں وہاں سے خاموشی سے سرک آئے۔ لوگ آتے چلے جا رہے تھے فوراً بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ دوار میں فوراً سے دور ہوتے جا رہے تھے۔

اب اہلا ہوا چلا تھا۔ برکت چائے والے کی دکان کھل چکی تھی اور چائے پر کئی کھٹی میں پانی سنتا لگا تھا۔ حامی صاحب اور فٹنی احمد دین دونوں کی طرح آج بھی سمجھ و ادب سے ہوتے ہوئے یہاں آچھپے تھے۔ حامی صاحب کے ہونٹ مل رہے تھے اور انھیں میں قہقہہ کر رہی تھی۔ وہ دوار میں ان سے کسی قدر ہٹ کر موطہ حویں پر بیٹھے تھے اور سامنے پڑی ہوئی ٹوٹی پھوٹی میز پر چٹنی خالی

چائیس کے ساتھ چائے کا انتظار کر رہے تھے۔ برکت نے دوسرے چائے پر دودھ کی کڑھائی رکھی۔ پھر چائے کے رتن صاف کرنے لگا۔ پھر چائیاں پکڑے سے پوچھتے پوچھتے فٹنی احمد دین سے مخاطب ہوا۔ "فٹنی صاحب جی۔"

فٹنی احمد دین نے سوالیہ نظروں سے برکت کو دیکھا۔ برکت ہوا۔ "فٹنی صاحب جی، مارکیٹ میں آگ لگی تو انہوں نے کہہ دیا کہ بھگم نے آگ لگائی ہے۔ اب پوچھو یا آگ کس نے لگائی ہے۔"

فٹنی احمد دین نے ہنسن بھرنے لہجہ میں کہا کہ "بھئی عمارتی کچھ میں تو کچھ نہیں آتا کہ یہ سب ہو گیا رہا ہے اور کیاں ہو رہا ہے۔ کیاں حامی صاحب؟"

حامی صاحب نے قہقہہ بھیرتے بھیرتے غصہ سانس بھرا۔ "اللہ ہم پر رحم کرے۔" فٹنی احمد دین بولے۔ "جب ہم ایک دوسرے پر غم نہیں کرتے تو اللہ ہم پر کیاں رحم کرے گا؟"

برکت نے پھر دیر لہجہ میں تائیدی۔ "بالکل سچ ہے جی۔" روز آگ روز آگ مد ہو گئی۔ "ہاں مد ہو گئی۔" فٹنی احمد دین بولے۔ عمارتی یہ خبر ہوئے کو آئی۔ اور کیا کیا سازنامہ نے دیکھا عمارتی آگ میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔

"کیوں جی کچھ چھوڑیں گے بھی یا سب سی ہلا ڈالیں گے؟"

حامی صاحب قہقہہ بھیرتے فٹنی احمد دین سے مخاطب ہوئے۔ "فٹنی صاحب جی میں یاد ہے جب پہلی حویلی میں آگ لگی تھی؟" "یاد ہے۔" حامی صاحب نے غصہ سانس بھرا۔ "وہ حویلی کیا علیٰ ہستی ہی مل گئی۔ بعض بعض عمارت اسی طرح جلتی ہے کہ ساتھ میں ہستی کی ہستی کا تھکا کا جھرنہ جاتی ہے۔ اللہ بس اپنا رحم کرے۔" حامی صاحب نے پھر ایک غصہ سانس بھرا اور چپ ہو گئے۔

حامی صاحب کی بات کا اثر ہوا کہ تھوڑی دیر کے لئے برکت فٹنی احمد دین بھی چپ ہو گئے۔ مگر پھر فٹنی احمد دین خاموشی سے کھبرا گئے۔ پوچھنے لگے۔ "حامی صاحب، پہلی حویلی تو تھوڑے دقتوں کی تھی۔"

"ہاں انہیں دقتوں کی عمارت تھی۔ حضرت مہاجر کی صاحب نے وہاں تین شب قیام فرمایا تھا۔"

"اچھا؟"

"ہاں۔ تیس سدان جب واقعہ دراز مغرب کا وقت تھا حضرت صاحبہ مسئلے کی کاندھ پر چکی پٹنے مشغول رہے تھے۔"

"مسئلے کے اندر؟" برکت نے پکار کر سوال کیا۔

"ہاں اسٹبل کے اندر۔ اصل میں وہاں کچھ خبریں ہوئے تھے۔ خیال تھا کہ اسٹبل کی طرف کسی کا دھیان نہیں جائے گا۔ مگر کسی بے دین نے سی آئی ڈی کر دی۔ کلنگر ٹھوڑا کودتا میں مغرب کی اذان کے وقت آؤں دھکا۔ بولا کہ وہاں نواب صاحب ہم قہار! ٹھوڑا دیکھتا تھا۔ اسٹبل کھلو۔ نواب کے کا تو تو خون نہیں۔ مگر حاکم کہا کرتا۔ اسٹبل کھلو دیا۔"

حاجی صاحب بولتے بولتے رکے اور برکت اور مفتی احمد دین کام گلے میں آن اٹھا۔ "اچھا؟" "بھرا؟" "بھرا یہ کہ کلنگر کھینچا تھا اور داخل ہوا۔ کیا دیکھا کہ پانی فرش پہ کھرا ہوا جیسے ابھی ابھی کسی نے دھو کیا ہو۔ کونا خالی اسٹبل بچھا ہوا۔ حضرت صاحب قائب۔"

"قائب؟" برکت نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں" حاجی صاحب نے اطمینان کے لیے میں کہا۔

"کہاں گئے گی وہ؟"

"وہ" حاجی صاحب سہمراے۔ "حضرت صاحب؟ حضرت صاحب اس وقت تک مدینہ منورہ پہنچ چکے تھے۔"

"سبحان اللہ۔" مفتی احمد دین کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"کمال ہو گیا یہی۔" برکت کہتے کہتے کتلی کی طرف حوجہ ہوا۔ کتلی کا پانی اٹھنے لگا اور اسٹبل بھاپ کے زور سے اڑا ہوا تھا۔

اس نے کتلی چلے سے اتار چل دی۔ اس میں چائے کی پتی ڈالی اور پھیلایوں میں چائے تیار کرنے لگا۔

"حضرت صاحب بڑی ہستی تھے۔" مفتی احمد دین بولے۔

"بھائی انہیں کے قدم قدم کی برکت تھی۔" حاجی صاحب کہنے لگے "قدر میں خون کی نہریاں بہہ گئیں مگر حویلی پہ آگ لگی نہیں آئی۔"

چپ ہوئے تال کیا۔ پھر اُٹے اور بولے "تھوڑی قدر تھیں جس حویلی کا فرنگی کچھ نہیں بگاڑا تھا اسے آگے چل کر باغوں نے ہی آگ لگا دی۔"

ہم نے تو سنا ہے کہ وہ آگ بھی انگریز ہی نے لگوائی تھی؟ مفتی احمد دین بولے۔ "انگریز ہی نے لگوائی تھی۔ مگر کئی کس کے ہاتھوں سے اپنی ہی بھائیوں کے ہاتھوں لگی تھی؟"

"یہ ہے" مفتی احمد دین غورای قائل ہو گئے۔

برکت نے اب چائے بنا لی تھی۔ دو بیالیساں حاجی صاحب اور مفتی احمد دین کے سامنے رکھیں۔ چاروں بیالیساں دھاری میز پر لگا کر رکھ

دیں مفتی احمد دین نے بیالیس اپنی طرف سرکائی۔ ایک گھومتا لپا۔ پھر بیالیس کہتے ہوئے بولے۔ "مگر صاحب انگریز کا جواب نہیں۔"

یہ سنتے سنتے برکت نے جھری جھری لی جیسے اچانک اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ بولا "مفتی جی۔ وہ جو ایک گوری چوڑی والا دوسری منزل میں ٹھوڑا لے لیتے ہیں، وہاں رہتا تھا۔ وہ مجھے دکھائی نہیں دیا۔"

"تم مسٹر ٹھیکری بات کر رہے ہو؟"

"ہاں جی اس کی۔ اس وقت سب قلیوں والے داہر لٹے کھڑے تھے۔ جانے وہ کہاں تھا۔ دکھائی تو دیا نہیں۔" یہ کہتے کہتے وہ ہم سے خطاب ہوا۔ "صاحب جی آپ نے اسے دیکھا تھا۔"

وہ تو خاموش بیٹھا رہا میں نے سادگی سے کہا "بھئی نظر نہیں آیا۔"

"نیک تو میں کہہ رہا ہوں۔ نظر تو آیا نہیں۔ گیا کہاں؟"

اسے میں متاڑا گیا۔ تھا تھا کا سا پسینہ میں شرابور منہ پر اور بڑبڑایا "گتا ہے کہ پوری بلڈنگ ہی راکھ کا ڈھیر ہو جائے گی۔" ایک اتھو والی انگریز خیرکشی مفتی احمد دین کے قریب سمیت بند کر گیا۔ چکر تے کی جیب سے اچھا بیٹا رومال نکال کر دن پوچھنے لگا۔

"کچھ ہوئی کی؟" مفتی احمد دین نے کسی قدر تال سے پوچھا۔

"کم و دوں بڑی جلی جاری ہے۔" ممتاز چپ ہوا۔ پھر بڑبڑایا "گتا ہے کہ پوری بلڈنگ ہی راکھ کا ڈھیر ہو جائے گی۔"

حاجی صاحب نے تسبیح پھیرتے ممتاز کو گور سے دیکھا۔ پھر سوال کیا۔ "معاذ صاحب کو تو اطلاع کتنی تھی کی ہو گئی۔"

ممتاز نے برا سامنے بتایا "حاجی صاحب مجھے ہی صبح کس کا نام لے دیا۔"

حاجی صاحب نے بہت محنت سے کہا۔ "کیاں میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ کن صاحب موقعہ اوقات پہنچے یا نہیں پہنچے۔"

"کتنی کیا ہی ایسے جتنا رہا تھا جیسے کچھ خبر ہی نہیں ہے۔"

"خبر تو کسی کو بھی نہیں تھی۔ خبر ہو جاتی تو آگ کتنی ہی کیوں۔" مفتی احمد دین بولے۔

"اسے سب خبر تھی۔"

"معاذ صاحب کو خبر تھی؟" نلاد۔ یہ الزام تراشی ہے۔ "مفتی احمد دین نے بہت فیسے سے ممتاز کو دیکھا۔"

ممتاز نے مفتی احمد دین کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کی طرف سے منہ پھیر کر برکت سے خطاب ہوا۔ "برکت چائے

پلائے گا؟"

"ہاں جی۔ کیوں نہیں۔" برکت بھرتی سے چائے پانے لگا۔

اخبار فروش سانگلی پینل مارتا میز سے آیا۔ گزرتے گزرتے اردو کا ایک اخبار بیڑی کی طرف اچھلا اور چلا ادا بن گیا۔ مثنیٰ احمد دین نے اخبار اٹھا کر ایک ورق حاتی صاحب کو بکڑا دیا دوسرا ورق میز پر پھیلا کر غور پڑھنے لگے۔ برکت نے چائے بنا کر بیانی بڑھائی۔ ممتاز نے تھوڑا اٹھ کر بیانی میز پر رکھی۔ پینے لگا۔ مثنیٰ احمد دین نے کوئی خیر فرمایا پڑھی کوئی آدمی کسی کی صرف سرخی پر نظر ڈالی۔ پھر ورق حاتی صاحب کے حوالے کیا۔ پھر کہنے لگے۔ "حاتی صاحب مشرق وسطیٰ میں حالات بگڑتے ہی جا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ لڑائی پھر ہوگی۔"

"اور پھر عرب بارگھا میں گے۔" ممتاز نے چائے پیٹے پیٹے پھلے لہجہ میں بولا۔ برکت نے ٹکڑا لگایا۔ "پاکستان میدان میں آ جانے پھر سارے بیوروں کا کازاڑا ہو جائے گا۔" حاتی صاحب نے اخبار ایک طرف رکھا ایک خلیفہ سے زبردستی کے ساتھ بولے۔ "پاکستان پہلے گھر کی لڑائیوں کو تو ہٹا لے۔"

اس شخص نے برکت بہت اثر کیا۔ دکھ بھرے لہجہ میں کہنے لگے۔ "حاتی صاحب جی کیا بات ہے کہ مسلمان جہاں بھی ہیں وہاں آپس میں لڑ رہے ہیں۔ بس اسی میں مارے جا رہے ہیں۔"

حاتی صاحب نے تامل کیا۔ پھر بولے۔ "یہ دینے مسلمانوں کے خلاف جا رہا ہے۔" مثنیٰ احمد دین نے ٹکڑا لگایا۔ "یہ امریکہ کا زبان ہے۔"

برکت نے تردید کی۔ "اماں مثنیٰ جی امریکہ کی تو طاقت اڑ گئی ہے۔ میں جانوں اب وہیں کا زمانہ ہے۔"

"ایک ہی بات ہے۔" ممتاز نے گھڑی بولے لہجہ میں کہا۔

برکت حاتی صاحب سے مخاطب ہوا۔ "حاتی صاحب جی مسلمانوں کا زمانہ کب آوے گا۔"

"مسلمانوں کا زمانہ لنگ گیا۔" ممتاز اسی لہجہ میں بھر بولا۔

"باشاؤ سڑکے آوے گا۔" برکت نے احماد سے اعلان کیا۔

"ایسے ہی جیسے پاکستان سڑکے آئے ہے؟"

ممتاز کے اس وار نے برکت کو بالکل ہی ہبتا کر دیا۔ لا جواب ہو کر وہ دودھ کی کڑ حاتی والے چہلے کی طرف متوجہ ہو گیا اور زور زور سے آگ پھر گئے گا۔

ممتاز مثنیٰ احمد دین سے مخاطب ہوا۔ "مثنیٰ صاحب جی پہلے کیا تھا؟"

"پہلے تو چاکلہ قاتی۔" برکت نے چہلے کو اس کے حال پر چھوڑا اور گری میں آ گیا۔ "بس ہمارے دیکھنے دیکھنے اس نے عمل کھڑے کر لئے۔"

مثنیٰ احمد دین نے توجہ غوثی کی "بہت معنی آدی ہے۔"

"معنی آدی" ممتاز زور بھری مثنیٰ بھلا۔

برکت بولا۔ "مثنیٰ صاحب جی محنت کی کمائی میں بس روکھی روٹی کمائی جا سکتی ہے جا کاد میں نہیں بنائی جا سکتیں۔"

رمضان کچھان حالوں آیا کہ بولتے بولتے سب چپ ہو گئے۔ من جلسا ہوا کا لانس پتی ہوئی۔ کپڑے کا کچھ چلے ہوئے کچھ دھوئیں میں روپے ہوئے۔ سرتھ تک پہنچا ہوا۔

"رمضان چائے بناؤں حیرے لگے؟"

"نہیں کوکا کوا۔"

برکت نے جلدی سے ایک کوکا کوا کھولا۔ اور رمضان کے ہاتھ میں بکڑا دیا۔ جب دوئیں گھونٹ لی چکا تو خود ہی کھلا۔ "ماشرکی یہی غوثی کھول آئی ہے کوکاد چھوڑ آئی۔ بڑی مشکل سے کھلا ہے۔"

مثنیٰ احمد دین نے بڑی آتشیں سے بول چھلا۔ "خیریت سے تھا؟"

"نہیں جی اللہ نے بچا لیا۔ جب میں اندر پہنچا ہوں تو آگ بالکل چھو لے کے پاس آگنی جلی۔ اور سارے میں دھواں بھرا ہوا۔"

رمضان چپ ہوا۔ پھر بولا۔ "مگر مجھے نے کمال کر دیا جی چرچر چرچتی چوس رہا تھا۔ بالکل نہیں رو پیا۔"

ممتاز نے دانت پیسے آپ ہی آپ بڑبڑائے لگا۔ "سالا جی چکی اولادو۔"

رمضان ممتاز کو سمجھنے لگا۔ پھر اطمینان سے کہنے لگا۔ "اب پھس گیا جی ر۔"

"اوچھا؟"

"ہاں۔ دمست بکڑا گیا۔"

مثنیٰ احمد دین ہنسوں کے لہجہ میں کہنے لگے۔ "میں نے مٹا صاحب سے کہا تھا کہ یہ آدمی تمہیں بدنام کرانے گا۔ وہی ہوا۔"

برکت بولا۔ "پر پڑ رمضان مجھے کچھ اور لنگ پڑے ہے۔"

وہ چپ رہا۔ میں بھی چپ ہو گیا۔ ہم دونوں چپ چلنے لگے اور تک چپ چلنے رہے مگر میں نے کسی قدر جھٹکتے ہوئے کہا "تم میرے گھر آ جاؤ۔"

"تمہارے گھر۔" وہ جپ سے جہاں کہہ پتا سا ہو گیا۔

ہم اور تک خاموش چلنے رہے مجھے خیال ہوا کہ شاید آگ کے خیال نے اسے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ بات بدلنے کی نیت سے میں نے کوئی بات کہی۔ کوئی ادھر کی بات کوئی ادھر کی بات پھر اور ذکر نقل آئے۔ اور دور تک دھیان کیا۔ دن گرم تھا۔ دھوپ اچھی خاصی تیز تھی اور وہاں میں گھوم رہے تھے بے مقصد بے وجہ کبھی اس سڑک پہ کبھی اس سڑک پہ گشتہ آوارہ کی کہ روایت تازہ ہو رہی تھی۔ اب ہم پہلے کی طرح کہاں اکٹھے ہوتے تھے اور کب جتنی وہ پہروں اور مسلمان رات میں آوارہ پھرتے تھے اب اپنی اپنی زندگی تھی اپنا اپنا دھندا تھا۔ آج اچھے خاصے دنوں کے بعد ملے تھے اور جب ملے کہ کوچہ گرد کی کہ سوئی ہوئی رگ پھڑک اٹھی۔ سارے دن کھوتے رہے۔ رات گئے تک اس چائے خانے سے اٹھ کر اس چائے خانے میں اس چائے خانے سے اٹھ کر اس خرابے میں۔ آخر رات اٹھنے لگی اور میں اور وہ دونوں تھک کر چور ہو گئے۔ اچھا اب میں گھر چلا۔

"گھر؟" میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"ہاں گھر۔" وہ بولا۔ "میں نے اس جہت کے لیے بہت دکھ دیکھے ہیں اسے گرجا نہیں چاہتے۔"

"گھر...." چاہنے میں کیا کہنا چاہتا تھا۔ کچھ الجھ سا گیا۔

اس نے بہت حسرت سے کسی قدر فیر جہد بانی لہجہ میں کہا۔ "تم فیک سوچتے ہو گھر میں میرا نہیں چاہتا۔"

میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ چلا بھی گیا۔ اپنے گھر کی طرف۔ اپنی آگ کی طرف۔



لبا قصہ

اس نے مجھے حیران ہو کر دیکھا اور پوچھا "تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

میں نے کہا "بس تمہیں پتہ چل گیا۔ بتاؤ کہ قصہ کیا تھا؟"

کہنے لگا "یار اصل میں دو قسمی میری کہانیاں تھیں۔ ہم دونوں نے ایک ہی کیکس لے رکھے تھے اور بات یہاں سے شروع ہوئی...." کہتے کہتے رکا جیسا ہے بہت سی باتیں ایک دم سے یاد آ گئی ہیں۔ "یار تم نے مجھے جھپڑا دیا۔ قصہ لہسا ہے۔ تم پور ہو جاؤ گے۔"

"تمہیں۔" میں نے سادگی سے کہا "تم نہ ڈ۔"

اس نے پھر میری لی عمر بات شروع کرنے لگا تھا کہ افکار اور مظفر آ گئے۔ ان کے ساتھ کئی ایک یار اور آ گئے۔ مجھ سے آہستہ سے بولا۔ "یہاں بات نہیں ہو سکتی کبھی الگ جگہیں کے تو سامنے میں گئے۔"

پھر افکار دن پونٹ کا ڈر لے بیٹا۔ مظفر بولا۔ "دن پونٹ کا ٹوٹا ہی تھا۔"

"کیوں ٹوٹا تھا؟" افکار نے پوچھا۔

اس نے افکار اور مظفر دونوں کو پیچھے دھکیلا اور دن پونٹ کے مسئلہ کا تفصیلی تجربہ کر ڈیا۔ بات کہاں سے پہلی کہاں تک پہنچی رہی تک پھر امریکہ تک پھر دیت نام تک پھر چین تک اور اب شام ہو نے لگی تھی۔ افکار اور مظفر کسانے۔ میں انکو چلا تھا۔ مگر اس نے کہا "مگر اس نے کہا میرا خیرہ بھی پورا نہیں ہوا ہے۔"

اس کا خیرہ آج کیا بھی ہو رہا ہوتے نہیں دیکھا گیا۔ اب یہ روز کا معمول تھا کہ ڈیڑھ دو بجے تک ہم اپنے اپنے دفاتروں سے نہایت جفا کر یا جان چڑا کر اس ریسٹوران میں آ بیٹھتے۔ یہ جازوں کے دن تھے اور اس ریسٹوران میں ایک اچھا بھلا دن تھا۔ ہم ہمیں ویڈیو چائے پیتے تھے۔ دھوپ بیٹھتے تھے اور سیاست پر باتیں کرتے تھے۔

میں نے کئی بار افکار اور مظفر کی عدم موجودگی سے ٹانہ دھاکا کر دیا کہ جھپڑا۔ "اس نے ہر بار ایک پھر میری لی۔ بات شروع کی ہوا

ہوں کہ....." اور اسے میں اٹھ کر اور منظر آن پہنچا بات سچ کی سچ میں روگنی بیٹھ اس پر تکی کر قہر لیا ہے۔ فرصت سے الگ بیٹھیں گے تو بات کر رہا ہے۔

کئی بار اس نے بیڑا ہوا کر کہا "یار کیا مصیبت ہے ہم کوئی ذاتی بات کر رہی نہیں تھے انکار اور منظر ایک دوسری جگہ سے گزرتا جاتا ہے۔ روزوی سیاست روزی باتیں" اور روزیہ ہوتا کہ وہ خود بحث میں شامل ہو جاتا۔ یوں چلا جاتا یہاں تک کہ شام ہو جاتی "ہم کہتے کہ چٹا چاہتے۔ وہ کہتا کہ" ابھی میرا خضر پورا نہیں ہوا ہے۔"

ایک دوسرے دروغوں غرض آیا "تو یار آج ہم نے ان کا پتہ کاٹ دیا۔" وہ چوری جگہ ملنے لگا کئی ہے سچ دیکھئے۔"

"مگر" میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

یولا۔ "ابھی تمہیں بھی اپنا قہر سنا دے گا۔"

"مجھے؟" میں نے شہنشاہ کر کہا۔

"ہاں تمہیں۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"بس جیسے تم نے میرے قہر کو سنا دیا ہے میں نے بھی تمہارے قہر کو سنا دیا۔"

"یار ہمارا قہر پرانی بات ہو گئی۔"

"کوئی ہرگز نہیں۔" وہ یولا اپنا قہر بھی اپ پرانا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "ابھی چاہے تنگوا ہے اسے۔"

چاہے کا آواز دیا۔ سچ کا سکرور سے سے چھو۔ ایک نیلی فون آ گیا۔ اسے جا کر سنا۔ چائے آ گئی۔ میں نے اس کے لئے بیٹلی۔ اپنے لئے بیٹلی۔

"ابھی اب سناؤ۔"

مذہب کے لہجہ میں یولا "یار داستان یہی ہے۔"

"کوئی ہرگز نہیں سناؤ۔"

"ابھی" اس نے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ پھر کچھ سوچنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی جاری تھی۔ جیسے باتیں

یاد آ رہی ہوں۔

باتیں یاد آتی جلی جاری تھیں اور آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی جلی جاری تھی۔ میں اسے نکلتا رہا۔ اور اب مجھے بھی بھولی بھری باتیں یاد آ رہی تھیں۔ کوئی اس کا بیڑا سارے کوئی اپنی جلی بات۔ کوئی یہاں سے کوئی وہاں سے۔ سو میں بھی خیالوں میں کھو گیا۔

ہم چپ چاپ بیٹھے تھے اور دھوپ ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ چاروں کی دھوپ جب ہوتی ہے۔ شروع میں اس سے طبیعت ہٹا شائش ہوتی ہے زیادہ دیر ٹھکوتی دھوپ آتی کہ وہ اس کر دیتی ہے۔ شاید اسی چاروں کی دھوپ کے ساتھ اترتی ہے اور مساموں میں دھوپ کے رہنے کے ساتھ رجی جلی جاتی ہے۔ دھوپ میں میری آنکھیں پیلے مندی گئیں۔ پھر کچھ اونگھی آ گئی۔ کچھ یاد آئی کچھ نیند۔ کئی مرتبہ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ اسی طرح تم سم دیتا تھا۔ میں پھر یادوں اور نیند کی جلی کلیت میں کھو گیا۔

آخر میں نے بھر بھری لی۔ چاروں طرف دیکھا۔ دھوپ اب ڈھلنے لگی تھی اور چھاؤں سرکتے سرکتے ہماری میز کے پاس آ گئی تھی۔ میں نے اسے ٹھوکا۔ "یار تم بالکل ہی چپ ہو گئے۔"

اس نے مندی ہوئی آنکھیں کھولیں کئی بار جھپکا میں پھر افسردہ لہجہ میں یولا۔

"ہاں یار" پھر بول بولنا بھائی لی۔ پھر ایک لمبی آنکھ لائی۔ جیسے خیالوں کی دنیا میں بہت دور نکل گیا تھا اور اب واپس آنے کی کوشش کر رہا ہوں "یار چاہے تو بالکل غلطی ہو گئی۔"

میں نے ہر سے کو بولا یا نہی چائے ملائی۔ بیٹلی پیٹے پیٹے دو بولا۔ "تم بھی کچھ کہو۔"

"میں؟"

"ہاں تم"

"کیا کیا یار۔"

"ہاں یار کیا کہیں۔" وہ افسردگی سے بولا۔

پھر ہم دونوں خاموش ہو گئے اور چائے پیٹے رہے۔ پھر میں بولا "دھوپ میں چٹلی آ گئی ہے۔ موسم بدل گیا۔"

"ہاں موسم بدل ہی گیا۔" اس نے جواب دیا۔

ہم پھر چپ تھے۔ چھاؤں سرکتے سرکتے میز پر اور میز سے ہمارے سروں پر آ گئی تھی۔

دو دو "اب نہیں۔"

"ہاں چلتا ہی چاہئے۔"

ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور چل پڑے۔ پلٹے پلٹے دو دو "کیا خیال ہے تمہارا دونوں ٹوٹا چاہئے تھا یا نہیں ٹوٹا چاہئے تھا۔"

میں الجھتا ہوں۔ "چھٹیں یا ٹوٹا چاہئے تھا یا نہیں ٹوٹا چاہئے تھا۔"

وہ تھوڑی دیر چپ چلتا رہا۔ پھر "ہاں ہاں چھٹیں۔"

اور پھر ہم چپ چپ پلٹے گئے۔



وہ اور میں

اب اس میز پر بس چاہئے کے ہاں رہتے تھے اور مجھے ہوئے سگریٹوں کے کھوے۔ سگریٹ کی راکھ کچھ میز پر بکھری ہوئی، کچھ ایش نرے میں پڑی ہوئی اس نے میز کا جائزہ لیا پھر کاؤنٹر پر گیا۔ سگرے چمکا۔ "وہ نرے کے برابر والی جو میز ہے اس پر ایک شخص بیٹھا تھا وہ چلا گیا؟"

سگرے نے نرے کے برابر والی میز پر جو کاؤنٹر سے خاصے قاسلے پر قہی ایک نظر ڈالی پھر "ہاں" مجھے تو دھیان نہیں وہاں کون صاحب بیٹھے تھے۔"

"جیسا بات ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ "میں باقاعدہ گھوم گیا ہوں۔ دائیں آ کر دیکھتا ہوں تو غائب۔"

"آپ کے ساتھ تھا؟" سگرے نے سوال کیا۔

"نہیں۔"

"آپ اے جانتے تھے؟"

"میں ۱۷ سے ۱۸ شخص آ دی کو نہیں۔" اس نے غور سے بھرے لہجہ میں کہا۔

"پھر کیا مسئلہ ہے؟"

"مسئلہ تو کوئی نہیں۔"

"پھر بھی؟"

"نہیں مجھے اس پر کچھ شک ہے۔"

یہ سن کر سگرے کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے صدیق سے کہہ کر دھیان میں پڑی ہوئی میز کو صاف کرنا تھا "آواز دی" صدیق "ا"

جب صدیق قریب آ تو پوچھا "اس کو نے والی میز پر کون سا ہے؟"

صدیق نے نرے کے پاس والی میز پر نظر ڈالی پھر "اس پر تو اب کبھی ہے۔"

"کہاں ہے اکبر؟"

"مارکیٹ گیا ہے۔"

"شکر اس سے غائب ہو" اکبر آ جائے اسے پتہ ہوگا دیے کیا فک ہوا آپ کو؟"

"بس نئی جی کو فک سا ہوا تھا" اس نے نالے ہوئے کہا اور کاؤنٹر سے پٹنے لگا تھا کہ مجھ نے اسے آواز دی۔" ذیہ ی صاحب کیا قصہ ہے؟"

"قصہ کچھ بھی نہیں۔" وہ مجھ کی میز کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "کچھ جیب سی بات ہے۔"

"کیا؟" مجھ نے تجسس آ میرا جیب میں پچھا اور ساتھ ہی اسے پیٹنے لگا۔ وہ کرسی صمبٹ کر بیٹھا اور بولا "دوڑینے کے قریب جو میرے وہاں ایک شخص بیٹھا تھا؟ تم نے دیکھا تھا؟"

مجھ نے مرکز بنے کے قریب والی میز پر نظر ڈالی۔ "نہیں یاد میں ہے تو اس طرف دھیان ہی نہیں کیا تھا۔ کون تھا وہ؟"

"جائے کون تھا مجھے تو وہ غلطی آدمی نظر آ تھا۔ میں تاہم وہم کیا ہوں اب اس آقا تو غائب۔"

مجھ نے سوچا بھر کہا "اچھا۔۔۔۔۔ لیکن اگر وہ جاتا تو آخری دروازے سے جاتا اور میں یہاں بیٹھا ہوں میں نے کسی کو جائے نہیں دیکھا۔"

"پھر تو یہ اور بھی جیب بات ہے۔"

"ہاں واقعی اگر وہاں کوئی تھا تو اب نہیں ہے تو جیب سی بات ہے اور اس وقت تو ایسا ریش بھی نہیں ہے۔"

مجھ کے کہنے پر اس نے ارد گرد کی خالی میزوں پر نظر ڈالی اور بولا "ہاں واقعی اس وقت تو ایسا ریش بھی نہیں ہے۔"

"چھوڑو یاد ہوگا کوئی تم چائے پیو۔" اور مجھ نے خالی رنگی ہوئی پیالی میں چائے بنائی اور اس کے آگے سرکا دی۔

اس نے چائے پی۔ اور اھر کی باتیں کیں پھر کہنے لگا۔ "بعض صورتیں جیب ہوتی ہیں کہ آدمی کو فک میں ڈال دیتی ہیں۔" پھر

جیسے سے کچھ یاد آ گیا ہوں "ایک دفعہ میرے ساتھ ایسا واقعہ ہو چکا ہے۔"

"کیا؟"

"بس ایسا ہی۔ اور ای ریستوران میں۔ یہ جنگ کے دنوں کی بات ہے۔ کاؤنٹر کے برابر والی جو میز ہے وہاں ایک شخص بیٹھا

تھا ہوں والا لباس پہنے ہوئے۔ کئی ڈاڑھی موٹھیں اور بڑے رکھے ہوئے مگر پتہ نہیں کیاں وہ آدمی مجھے اچھا نہیں لگا۔ پھر میں نے

ایک دفعہ اسے غور سے جو دیکھا تو کیا دیکھا ہوں کہ اس کی لمبی ترشی ہوئی نہیں ہیں۔ میرا تھا ٹھنکا۔ سوچا کہ یہ شخص مسلمان تو نہیں ہو

سکتا۔ کبھی سوچے سوچے میں نے سامنے میز پر بڑے ہوئے اخبار اٹھائے۔ انہیں اٹھتے پٹنے لگا۔ نظر اٹھا کر جو دیکھا تو وہ غائب" میں

پنکلا لپک کر باہر لگا دیکھا ہوں کہ تیر قدم اٹھاتا ہوا مارکیٹ کی طرف جا رہا ہے۔ میں بھی تیز تیز اس کے پیچھے چلا۔ مگر مارکیٹ میں

داخل ہوتے ہوتے وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اھر دیکھا اھر دیکھا کس دکھائی نہ دیا۔ یا اللہ آدمی تھا یا چٹاوا۔ مگر مارکیٹ سے

لگا۔ سو گت سو گت ایک ایک کی شکل گیا۔ پکا ایک مجھے احساس ہوا کہ میرے پیچھے کوئی آ رہا ہے اور جیسے کسر بھر ہو رہی ہے۔ میں نے مز

کر دیکھا۔ کیا دیکھا ہوں کہ ایک ٹوٹی میرے پیچھے آگئی ہوئی ہے۔ کچھ بچے کچھ بڑے اور سی آدمی کھنی ڈاڑھی موٹھیں کھلیں بڑھی

ہوئیں۔ اب میں آگے آگے اور وہ پیچھے پیچھے مگر پھر میں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ سوز جڑا پا تو ہلدی سے مڑا اور ایک گلی میں تنک گیا۔"

مجھ نے اسے حیرت سے دیکھا اور کہا "کھر پٹے تو تم اس کا تعاقب کر رہے تھے۔"

"ہاں مگر اب وہ میرا تعاقب کر رہا تھا۔"

مجھ کھٹکا کر بھا۔ "کبھی کبھی جوں بھی ہوتا ہے۔"

"ہاں کبھی کبھی جوں بھی ہوتا ہے۔" وہ بولا "اور وہ تو جنگ کا زمانہ تھا۔ پتہ نہیں تھا راجہ یہ کیا ہے مجھے تو ان دنوں جوں لگتا تھا جیسے

اچانک کچھ نئی چیز سے دار سے درمیان داخل ہو گئے ہیں۔" مجھ جو ابھی تنک شہ رہا تھا یہ سن کر کچھ ٹھپہ ہو گیا۔ کہنے لگا "اس وقت تو

نہیں مگر اب مجھے واقعی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اپنی اور اناتو س چروں میں گھر گئے ہیں۔" اور یہ کہتے کہتے مجھ کے لہجہ میں بھی

ایک خوش تش کا رنگ پیدا ہو گیا۔

"فیک کہتے ہو میرا ابھی یہی احساس ہے۔"

مجھ بھر بولا "پہلے تو بڑا آدمی بڑا آدمی کو بھینچا تھا۔ مگر اب ایسا ٹھپا ہوا ہے کہ کوئی کسی نہیں بھینچتا۔"

"آخر کیوں؟"

"بس دھماکا ٹوٹ گیا ہے اور ہم بکھر گئے ہیں۔"

مجھ چپ ہو گیا۔ وہ بھی چپ ہو گیا۔ دونوں خاموشی سے چائے پیتے گئے اس کا ذہن بھر بھٹکنے لگا تھا۔ وہ اپنی جس کی لمبی ترشی

ہوئی نہیں تھیں۔ اس کا مارکیٹ کی طرف ہانا اور اچھل ہو جانا۔ مارکیٹ سے گلی میں پیچھے پیچھے اٹھتے ہوئے قدموں کی بجلی آہٹے

مڑ گئیاں "کچھ بچے کچھ بڑے اور وہ اپنی مائوٹوں چرو۔"

"یہ مل ہے ٹی"

"مل؟" اس کے خیالوں کا دھماکا پھٹا۔ "یہ کونسا مل ہے؟"

"چائے کا"

"کوئی چائے کا؟"

"ابھی جب آپ اس میز پر بیٹھے تھے۔" اکبر نے ذہینے والی میز کی طرف اشارہ کیا۔

"وہاں میں بیٹھا تھا؟" اس نے حیرت سے اکبر کو دیکھا۔

"ہاں ٹی"

"میں؟۔۔۔۔۔ اچھا۔"

"ہاں ٹی آپ" اکبر بولا۔

"اچھا" اس نے یہ کہتے کہتے مل ادا کیا۔ پھر سکتوں میں آ گیا۔ "کچھ خوف" کچھ غرور کی "جی ہوئی آواز میں بڑبڑایا۔" مجھے بھی شک

سا ہوا تھا۔"

"کیا؟" مجھ نے پوچھا۔

"میں کیوں کہیں میں ہی تو نہیں تھا؟"



وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے

پھر یہی ہوا کہ یاجرجن یاجرجن رات بھر دیوار کو چاٹا۔ یہاں تک کہ دیوار جھل جھل ہوتے ہوئے اڑنے کے چھٹکے کی مانند ہو گئی اور پھر یاجرجن یاجرجن تھک گئے اور انہیں نیند آنے لگی اور وہ یہ کہہ کر سو گئے کہ باقی دیوار صبح کو چائیں گے مگر جب وہ صبح کو اٹھے تو دیوار بھر اونچی اور سوئی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ اپنی کوتاہی پر کھینچتا ہے اور انہوں نے پھر یہ عزم باندھا کہ آج تو صبح دیوار چاٹ کر دی ملیں گے۔ سو جب شام ہوئی تو پھر وہ اپنی لمبی لمبی زبانیں لٹال کر دیوار کو چاٹنے لگے۔ چاٹتے رہے چاٹتے رہے یہاں تک کہ رات کا کھرا پھلنے لگا اور دیوار اڑنے کے چھٹکے کی مثال رو گئی مگر یاجرجن یاجرجن اب تھک کر چور ہو گئے تھے اور زبان انہیں کھینچ لگی تھی اور بچے نے نیند سے بوجھل ہو رہے تھے۔ انہوں نے آپس میں کہا کہ سدا سکھری کو ہم نے واقعی چاٹ لیا ہے ہم بھر کے لئے سوئیں۔ پھر تازہ دم ہو جائیں گے اور روز بانیس بھیر کر اس کا ستر اڑ کر دیں گے۔ سو یاجرجن نے ایک کان نیچے کھینچا یا اور دوسرا کان اوڑھ کر سو گیا۔ یاجرجن نے بھی اپنا ایک کان نیچے کھینچا یا اور دوسرا کان اوڑھ کر سو گیا۔

یاجرجن یاجرجن صبح کو سو کر اٹھے تو انہوں نے دیکھا کہ دیوار تو پھر پھر اڑی مثال ان کے سروں پر کھڑی ہے۔ یہ دیکھ کر وہ ایسے اڑے گئے جیسے برسات میں مٹی کی دیوار ڈھے جاتی ہے۔ یاجرجن نے بہت دکھ کے ساتھ یاجرجن سے کہا کہ "اے یاجرجن! کیا ہمارے مل کا کوئی حاصل کا کوئی حاصل نہیں ہے۔"

"یاجرجن واقعی آواز میں بولا کہ" شاید ہماری تقدیر ہی یہ ہے کہ روز رات کو دیوار چاٹا کریں۔ اور روز صبح کو دیوار کو ہر اس کی طرح ہمارے سروں پر کھڑی ہو جائے گا کرے۔

اس پر یاجرجن یاجرجن ہو کر بولا کہ "اگر یہی بات ہے تو دیوار کو ہم چاٹا کئے تو کیا" اور نہ چاٹا تو کیا۔ پس قفل اس کے کہ وقت ہمیں چاٹ سنے انہیں چاہیے کہ دیوار کی طرف پشت کریں اور تھوڑا ننگی گلو کھیں۔"

جب قوم یاجرجن یاجرجن کا وہ یوڑھا جا جواب اپنی عمر کے بڑا دیں سال میں تھا پھاڑی کھوہ سے نکل کر باہر آیا اور بولا کہ "اے یاجرجن یاجرجن ہر شے کے ایک معنی ہیں اور ہر مل کا ایک حاصل ہے کوئی دیوار انہی نہیں کہ سدا کھڑی رہے۔ ذرا صبر دیوار کا اور چاٹنا

زبان کا مقصد ہے اور میں نے تمہارے باپ یاٹ سے اور تمہارے باپ یاٹ نے اپنے باپ نوح سے یہ سنا ہے کہ اولاد ان کی مدد سکھری کو دینے چاہتے تھے لیکن جیسے دن رات کو چاہتے لیتا ہے۔ پھر وہ آواز دہرا کر کھینچنے لگا اور شاہاب ہرزو زاروں میں بھیل جانے کی اور وہ زبانیں جو بھڑپاتی تھیں۔ شیریں ہاتھوں تک پتھریں کی پہلے تو یہ ماہرین کا انکار اور طبرستان کے قلعے سے نکلے خٹے تک پہنچے گا اور وہ اتنا پیاسا ہوگا کہ خٹے کا سارا پانی پی جائے گا جب بھٹلا کر وہ وہاں پہنچے گا تو خشک خٹے کو دیکھ کر کہے گا کہ شاید یہاں آگے بھی جاتی تھی۔

بوز حیات وہاں پہاڑ کی کھوڑ میں چلا گیا گراس کی بات ماہرین کے بیٹے نے سن لی تھی۔ اور اس نے اپنے پہاڑ میں جا کر آل ماہرین کو جمع کیا اور سوال کر ڈالا کہ "اے آل ماہرین! کیا تم سکھری کے ٹوٹ جانے پر بھی پیچھے رہ جانے والوں میں رہو گے۔"

آل ماہرین نے بوجھاکر "تو نے کہا دیکھا جو ایسا سوال زبان پر لاؤ۔"

ماہرین کا چنا ہوا کہ "کیا تم نہیں دیکھتے کہ آل ماہرین نے سبز پہاڑ پر قبضہ کر رکھا ہے اور ہمارے حصہ میں بھر پہاڑ آیا ہے۔ وہ بھید بھر کر حمل کھاتے ہیں جب کہ ہم بھر چاہتے ہیں۔ اب جبکہ سکھری نوٹے کو ہے تو میں نے قوم کے بزرگ سے یہ سنا ہے کہ جو کہ وہ قبضہ سکھری سے پہلے نکلے گا وہ طبرستان کے شیریں خٹے پر پہلے پہنچے گا اور سیراب ہوگا۔ جو کہ وہ بعد میں نکلے گا وہ خٹے پر بعد میں پہنچے گا اور اسے خشک پائے گا تو اسے ماہرین کے حرم میں "کیا تم اس قید سے رہائی کے بعد بھی پیچھے رہ جانے والوں میں رہو گے۔" یہ حکام سن کر آل ماہرین نے تباہ کیا اور رنج کر کہا کہ "اپنے باپ ماہرین کی اس لمبی زبان کی قسم جو سکھری کو چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے پہنچے وہاں جاتی ہے ہم پیچھے رہ جانے والوں میں نہیں رہیں گے اور کچھ نہیں ہوں گے۔"

اور آل ماہرین کو بھی یہ خبر مل چکی تھی کہ سکھری اب دھینچے والی ہے اور آل ماہرین سب سے پہلے لعل کبر طبرستان کے خٹے سے سیراب ہونے کے لئے کہنا بند رہی ہے۔ آل ماہرین نے یہ سوچ کر فطریہ کیا کہ ماہرین کی آل نے ابھی سے چشموں پر قبضہ کرنے اور ہرزو زاروں پر چھا جانے کے خواب دیکھے شروع کر دیے ہیں انہوں نے فطریہ کیا اور اعلان کیا کہ ہم ان میں سے نہیں ہوں گے جو پیچھے رہ جاتے ہیں اور سوکھے خٹے سے نکل پڑتے ہیں۔ سو ابھی رات باقی ہے وہ اپنے پہاڑ سے نکل پڑے تھے اور آل ماہرین سے پہلے اور ایک نکلی جانا چاہتے تھے۔

رات کے اندھیرے میں ماہرین کے بیٹوں نے ماہرین کے بیٹوں کا راستہ کاٹا اور ماہرین کے بیٹوں نے لپک کر ماہرین کے بیٹوں کو ہالیا۔ تب ماہرین کے بیٹے ماہرین کی بیٹوں سے اٹھے اور ماہرین کے بیٹوں نے ماہرین کے بیٹوں کو لٹکا دیا۔ وہ آج میں ٹوٹے

مرتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور انہوں نے دیکھا کہ ماہرین ماہرین سے پڑے ہیں اور سکھری بھر اوجھی اور موتی ہو گئی ہے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے اپنی راہوں اور واپس اپنے پہاڑوں پر چلے گئے۔

جب پہاڑ ساکن گت کیا اور رات نے زور کیا تب ماہرین ماہرین نے بھر اپنی زبانیں تیز کیں اور بوجار چائی شروع کر دی اور ابھی رات باقی تھی کہ رات کے دھمے جانے کی امید لے کر اور شیریں خٹے سے سیرابی کا تصور بانہ کر آل ماہرین اپنے پہاڑ سے نکلے اور آل ماہرین اپنے پہاڑ سے برآمد ہوئی۔ انہوں نے بھر ایک دوسرے کا راستہ کاٹا اور آج میں سب دگر گیاں ہوئے۔

ماہرین ماہرین کے بیٹے رات بھر آج میں شراکرا کئے اور غولم غولم ہو گئے۔ جب ترکا ہوا تو انہوں نے یہ دیکھا کہ ماہرین ماہرین سگے ہیں اور بوجار بھر پہاڑ کی طرح بلند اور سنگین ہو گئی ہے یہ دیکھ کر وہ حیران ہوئے انہوں نے اپنے چاروں بچہ اور واپس اپنے اپنے پہاڑوں کو ہو گئے۔

دن بھر کسی نہ کسی طور تک گیا اور رات بھر آج میں گت کر آل ماہرین جو یہ کہنے کے نکلے تھے ان پر جہول دیا۔ انہوں نے ان کے گھر نکال دیکھا تو انہوں نے یہ خبری میں آل ماہرین کو ہالیا اور ان کے پہاڑ سے نکلے سے پہلے ان پر جہول دیا۔ انہوں نے ان کے گھر کو گونا گونا توں کو قتل کیا اور غولم غولم کو بے عزت کیا۔ یہ قیامت دیکھ کر ماہرین کی بیٹی اپنے ٹپے سے نکلے اور ماہرین کے بیٹوں سے مخاطب ہوئی کہ

"اے میرے دادا کے بیٹے کے حق کیا تم ہم میں سے نہیں ہو اور ہم تم میں سے نہیں ہیں کہ تم ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہو؟"

ماہرین کے بیٹے نے یہ سن کر تباہ کیا اور کہا کہ "اے ماہرین کی بیٹی ہم تم میں سے کیونکر ہو سکتے ہیں اور تم ہم میں سے کیسے ہو جب کہ ہم ماہرین کی اولاد اور اپنے پہاڑ میں رہتے ہیں اور تم ماہرین کی اولاد اور اپنے پہاڑ میں آ جاؤ۔"

ماہرین کی بیٹی نے یہ سن کر چلائی اور بولی "اے میرے دادا کے بیٹے کے بیٹے! کیا تو اس سے انکار کرے گا کہ ماہرین ماہرین ایک باپ سے پیدا ہوئے اور ایک ماں کی گود میں پلے۔"

ماہرین کا چنا ہوا نفسی انداز میں بولا کہ "اے ماہرین کی بیٹی! میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ ہم ماہرین کے بیٹے تو ہم ماہرین ہیں اور اپنے پہاڑ سے اپنے پہاڑ سے بچھانے جاتے ہیں۔"

ماہرین کے بیٹوں نے یہ سن کر بہن کو پیچھے دھکیلا اور اوجھی آواز میں کہا "ہم ماہرین کے بیٹے تو ہم ماہرین ہیں اور اپنے پہاڑ سے

کھانے جانتے ہیں۔"

اور پھر آل یا جرن نے آل یا جرن پر آل یا جرن کی بول دیا۔ یا جرن کی اولاد نے اولاد کے خون میں اور یا جرن کی اولاد نے یا جرن کی اولاد کے خون میں باہر گئے۔ صبح ہوئے پر یا جرن کی بیٹیوں نے جسوں پر پٹا باندھنے والے پریشان کئے اور برہنہ پٹا لہ کمال یا جرن کے پاس پہنچیں اور چلا گئیں کہ "اے عمارے باپ" تو گریہ کر کہ میرے بھائی کے بیٹوں کے ہاتھوں عمارے گھر پر بادلوں سے عمارے سہاگ اڑے اور عمارے ماں چاہوں کے خون سے عمارے زین لالہ زار ہو گئی۔"

یا جرن نے اپنی اولاد کو یہ حال دیکھا اور یا جرن کے پاس جا کر بولا کہ "اے یا جرن میرے بیٹوں نے میرے بیٹوں کو قتل کیا اور میری بیٹیوں کو رسوا کیا۔"

یا جرن نے یں کر لال پہنچا اور بولا کہ "اے یا جرن میرے فرزند ان میں سے ہیں جو میری بیٹیوں سے خود سیراب ہونا چاہتے ہیں اور دوسروں کو سیراب کئے کے درپے ہیں۔"

بات بات سے جتنے یہاں تک پہنچی کر شام ہونے پر یا جرن یا جرن نے اپنی اپنی زبانیں نکالیں اور سد سکدری کو چاہنے کی بجائے عالم فیتہ میں ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ دورات بھر ایک دوسرے کو چاہتے رہے حتیٰ کہ یا جرن یا جرن کے چاہنے سے اور یا جرن یا جرن کے چاہنے سے ان کے مثال ہو گیا۔ یا جرن نے دل میں سوچا کہ اب یا جرن میں روٹی کیا گیا ہے اب سو سے جانتے ہوں۔ صبح اٹھ کر ایک زبان زبانوں کا اور یا جرن کو چاہتے چاہوں گا۔ سو وہ اپنا ایک کان کھینچا کہ اور دوسرا کان اڑھ کر سو گیا۔ یا جرن نے بھی دل میں یہی کہا کہ یا جرن کے نام کا تو ایک پھلکارہ کیا ہے تو اڑا آرام کرو۔ صبح اٹھ کر ایک زبان بچھروں گا اور اسے سقاچٹ کر چاہوں گا سو وہ بھی ایک کان کھینچا کہ دوسرا کان اوپر سے لے پڑا۔

جب یا جرن یا جرن سو کر اٹھے یا جرن نے یا جرن کو اور یا جرن نے یا جرن کو زورم زورم یا اور جیران ہوئے۔ بھریا جرن کے پاس آل یا جرن اور یا جرن کے پاس آل یا جرن تار و دھن کرتی پہنچی کہ رات بھر آل یا جرن نے آل یا جرن کا اور آل یا جرن نے آل یا جرن کا خون بہایا تھا۔ جب بھریا جرن نے یا جرن پر دانت کاگیا کہ اور کہا کہ میں تجھے اور میری آل کو یوں چانوں گا جیسے سد سکدری کو چاننا ہوں اور یا جرن نے یا جرن پر زبان تیزی اور چلائی کہ میں سد سکدری کو بھد میں اور تجھے اور میری آل کو پہلے چانوں گا اور شام پڑے سے وہ بھر ایک دوسرے کو چاہنے لگے اور چاہتے ہی چلے گئے حتیٰ کہ دونوں ان کے چھلکے کی مثال رہ گئے عراب ان کی زبانیں اٹھنے پہنچی جس اور انگوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ یا جرن نے کئے کیا کہ یا جرن ہمہ برابر توباتی رہ گیا ہے۔ اتفاقاً کو چاہتے

لوں گا۔ سو وہ اپنا ایک کان کھینچا کہ دوسرا کان اوپر تان سو گیا۔ یا جرن نے بھی یہی سوچا کہ باقی ماندہ یا جرن کو کب چاہتے کر ختم کر دوں گا۔ وہ بھی ایک کان کھینچا کہ دوسرے کان کو لکاف کی طرح اڑھ کر سو گیا۔

صبح جب یا جرن کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے کان کے اندر سے جھانک کر یا جرن کو دیکھا اور اسے زورم زورم دیکھ کر حیرت ہوا۔ پوچھا کہ "اے یا جرن کیا میں نے تجھے چاہتے نہیں لیا تھا؟" یا جرن خود اسے خود دست دیکھ کر حیرت ہوا۔ پوچھنے لگے "تمہارے یا جرن میں نے تجھے کیا چاہتے نہیں لیا تھا؟" اور بھر دونوں کی آل خلم خلم اپنے اپنے بزرگ کے پاس پہنچی اور فریادی ہوئی۔ یا جرن یا جرن اپنی اپنی اولاد کی فریادیں کر بھر ایک دوسرے پر فراسے بھراں کی لمبی لمبی زبانیں ان کے منہ سے یوں ابھرنے لگیں جیسے باہمی سے سانپ نکلنے لگے۔

یا جرن یا جرن ایک دوسرے کی طرف زبان اتراتے تھے کہ یوز حاردا آشنہ بھراہنی کھوے ہے ہر لعل آیا۔ یا جرن یا جرن کو دیکھ کر اس نے افسوس کیا اور کہا "اے یا جرن یا جرن" تمہارا بڑا بھوکہ تم سد سکدری کو کھو نہ چاہتے تھے ایک دوسرے کو کچ چاہنے کے لئے رہے ہو۔"

جب یا جرن نے اپنی آل کا ماتم کیا۔ دونوں نے یوز سے انصاف چاہا۔ یوز حاردا آشنہ دونوں کی بات سن کر بولا کہ "میں بائیل اور قاتل کے درمیان تو فیصلہ کر سکتا تھا کہ کون قاتلم ہے اور کون مظلوم ہے کہ ان میں سے ایک قاتل تھا اور دوسرا مظلوم تھا مگر یا جرن یا جرن کے باب میں مجھے فیصلہ کروں کہ میں یا جرن کی زبان کو یا جرن کے خون سے اور یا جرن کی زبان کو یا جرن کے خون سے لال دیکھتا ہوں۔"

یا جرن نے کہا کہ "اے بزرگ کیا تو چاہتا ہے کہ آل یا جرن طبرستان کے خشے سے سیراب ہو اور میری آل سوکے خشے کے ٹکڑے بھر چاہئے؟"

یا جرن بولا کہ "اے بزرگ کیا تو یہ گوارہ کرے گا کہ آل یا جرن طبرستان کا پورا چشمہ دکھیں اور میری آل بھڑک بھرے؟"

یوز حاردا کہ "طبرستان کا چشمہ کس نے دیکھا ہے وہ تو سد سکدری کے اس طرف ہے اس چشمہ سے وہ سیراب ہو گا مگر پہلے بھر چاہئے گا کہ وہ بھول چاہئے گا۔"

جب یا جرن نے اعلان کیا کہ میں پہلے یا جرن کو چاہتے ہوں اور بھر سکدری کے کھڑے کئے ہوئے بھر چانوں گا۔ یا جرن کہہ گیا کہ میں

یا جرن کو اس کے آخری سچے نیک چاہتوں کا پھر میں سد سکدری کو چالوں کا اور اپنی آل کو لے کر طبرستان کے خشمے تک پہنچوں گا۔
یوڑے نے انہیں انہوں کے ساتھ دیکھا اور کہا "چائنا یا جرن ماجرن کی زبانوں کا مقدربے وہ سد سکدری کو نہیں چاہیں گے تو
ایٹا یو چائیں گے۔"

اور یا جرن ماجرن اپنی لال ہوز بانوں کے ساتھ پھر آجس میں ختم تھا ہو گئے۔ یوڑے دانشدہ نے انہیں ختم تھا دیکھ کر ہمد
انہوں کہا کہ "یا جرن کی اولاد و دشمنانہ سانپ بن گئی کہ خود ہی کو کھس رہی ہے۔" اور یہ کہہ کر وہ وہاں اپنی کھوہ میں چلا گیا۔
یا جرن ماجرن اس اندھ صابری رات میں ایک دوسرے کو سمجھوڑتے رہے چاہتے رہے انہوں نے ایک دوسرے کو چائنا کھانا چاہا
کہ یوڑیکل یا جرن ماجرن گھٹ کر اٹھ سے کے پچھلے سے بھی کم ہو گئے۔



اندھی مکی

دونوں نے یکساں کی پلٹ کر دیکھا۔ کمر بہت تھا کچھ نظر نہیں آیا۔ پھر انہوں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی مگر کچھ نہ سنی۔
"یار کوئی نہیں ہے۔" ایک نے دوسرے سے کہا اور پھر جیل پڑے۔ مگر ابھی چار قدم چلے تھے کہ پھر صلف گئے۔ "یار کوئی ہے"
قریب ہوتی ہوئی آہٹ کو انہوں نے سنا۔ پھر ایک ساتھ بھاگ کھڑے ہوئے۔ سڑک سے اتر کر کچے میں آئے جہاں تھوڑا شیب
تھا۔ ان کا کھجواڑی اور ایک گھوڑا درست۔ دونوں درختوں کے پیچھے دیک کر بیٹھ گئے۔

کان اس آہٹ پر گئے ہوئے تھے جو قریب ہوتی جاری تھی اور دل دھڑ دھڑ کر رہے تھے۔ پھر ارشد نے تھوڑا سر نکال کر دیکھا
اور پک ایک کر بیٹھ گیا۔ "یار وہ تو گدھا ہے۔" نعیم نے سڑک پر نظر ڈالی۔ اسی دم اوپر سے ایک کنار ارشد کے سامنے آ کر گر گئی۔
"ارے کنار۔" اس نے اوپر درخت کی شاخوں پر نظر ڈالی جو کناروں سے لدی نظر آ رہی تھیں۔ "یار یہ تو ادھی کا کل ہے۔" اس نے
ایک ڈالا اٹھا کر کناروں سے لدی ایک شاخ پر جا کہ بار بار اٹھ کر کنار میں پیچھے آ چڑی اس نے شوق سے کنار میں اٹھائیں۔ نعیم کے
پاس آ کر بیٹھ گیا۔ "کھانا کھا۔"

ارشد نے کھاتے کھاتے پھر ری لی۔ "بہت کھنی ہیں" پھر کہنے لگا "ان سے کیا بنے گا کوئی پیٹ بھر نے کی چیز ہونی چاہتے بہت
بھوک لگی ہے۔"

یہ اس سفر میں بھوک کا پہلا اعلان تھا اور نہ کیا کھانا کھاتا کیسا چوٹ کبھی پھیل چلے ہوئے کبھی سختی میں ڈلے ہوئے کبھی گاڑی میں بیٹھے
ہوئے ان چٹوں میں سے جو چلنے وقت جب میں بھر گئے تھے ایک ڈیڑھ گھنٹی بار بار یہ سوچے ہوئے کہ بھوک کے چاہتیں۔ اوپر سے
پانی پنی لیا۔ مگر اس وقت ارشد نے ہاتھ دھو بھوک محسوس کی اور اس کا اعلان کیا۔ جواب میں نعیم نے نہوت کی دونوں ہمیں ٹوئیں اور نعیم
بھر چنے کالٹے ہوئے کہا "ابھی چنے باقی ہیں۔"

ارشد اور نعیم دونوں نے پختیاں بار بار کے چنے کھائے۔ ارشد نے چٹوں کے چنے ادھی کا بھی استعمال کیا۔ جب بی بھر گیا تو
ارشد نے اعلان کیا کہ ادھی کے ساتھ چٹوں کا بہت لطف آ یا۔ پھر وہ ادھی کے بڑ کو بچنے لگا جواب تھوڑا اچھا ہونے کے ساتھ اپنی

تصانیع کے ساتھ نظر آنے لگا تھا۔ اسے جی بھر کے دلچسپ لپٹنے کے بعد اس نے ایک کیفیت میں آنکھیں بند کر لیں یوں جیسا رہا جیسے دنیا وہاں لپٹا سے بہت فر ہو گیا ہو۔ پھر آنکھیں کھولیں۔ "خیرم"

قیم نے اسے فور سے دیکھا "کیا بات ہے؟"

"خیرم صدارت میں آج ایک اور عجیب و غریب واقعہ پیش آیا ہوگا۔"

قیم سوچ میں پڑ گیا۔ "ہوا" مجھے تو شک ہی ہے۔"

"خیرم وہاں سے ساتھ آتا تھا تو اچھا رہتا۔"

"میں نے اس سے کہا تھا کہ تم کیا تو وہاں سے نکل کے نہ آئے ہو تھوکل چلو۔ آگے جانے کی نسبت وہاں جانے میں زیادہ خطرہ ہے۔"

دونوں چپ ہو گئے۔ پھر قیم سوچے سوچے ہوا "میں نے جیسے بتایا تھا کہ میرے بہنوئی کے ساتھ کیا گزری۔"

"ہاں تم مجھے بتا چکے ہو۔"

"اب میں بھی وہاں سے چلا آیا۔۔۔ وہاں کی ہوگی۔"

"کون؟"

"میری بہن" قیم کی آواز بھرا گئی اور آگے بڑھی۔

ارشاد اسے خاموش دیکھا کیا۔ پھر ہوا "خیر اپنا تو کوئی رہائی نہیں تھے میں یاد کروں۔" وہ پھر اہلی کی اونچی شاخوں کو بچھنے لگا۔

حافظ نے آہستہ سے کمرٹ لی اور اس ایک ایک کر کے سب یاد آئے۔ وہ بھی جو مارے گئے اور وہ بھی لاپتہ ہو گئے اس کی آنکھیں میں آنسو ڈبانے لگے۔ سختی طویل ہے کسی کے بعد اس کے دل کی حرارت سے اور آنکھیں نمی سے آتش ہوئی تھیں۔

ایک تھپے سے شور نے دونوں کو بچا لیا۔ "طوطے" بے ساختہ ارشد کی زبان سے نکلا کہ ابھی آکھیں آسو سے لبریز تھی خوشی سے چٹک چھیں۔ طوطوں کی شور کرتی برات اہلی پر اترتی۔

ارشاد طوطا کھڑی کناروں کو پتہ نہ پڑے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بے ساختہ وہاں لپٹا ہوا انہوں کے تھے زبان کے نیچے دبا کے زور سے سنی سنائی ادا طوطے بھرا کر اڑ گئے۔ "دو دو یا خدا میں ایک ہزار بکھر دو رنگ چٹکتی چلی گئی۔" بس اب چلنا چاہئے۔"

دونوں اہلی کے نیچے سے نکل کر پھر سڑک پر آ گئے۔ ارشد نے خاموش سڑک پر دو رنگ نظر ڈالی۔ حیران ہوا "کمال ہے۔ سڑک

ذرا بھی تو نہیں بدلی ہے۔"

"خیر کتنی دور ہے اب تمہارا گھر" قیم ہوا۔

"تم نے بدلی ہوئی تو دیکھی ہوگی۔"

"بدلی ہوئی؟" قیم نے زبان پر زور ڈالا۔ "نہیں بات یہ ہے میں تو گاؤں سے سائیکل پر سیدھا اسکول آتا تھا اور سیدھا واپس چلا جاتا تھا۔ شہر میں نے زیادہ نہیں دیکھا۔"

"اچھا؟...." اچھا خیر یوں بکھو کے پہلے سیڑھی بٹایا آگئی۔ پھر وال مندر۔ پھر دلچا نکواں۔ اس نے کوئٹہ سے آگے ہو کر کوٹ ہے۔ اور پر کوٹ سے آگے بسا بیوں کی گلی ہے۔ بسا بیوں کی گلی سے نکلتا جلی ہوئی ہے۔ بسا بیوں کی گلی تو تم نے دیکھی ہوگی۔"

"بسا بیوں کی گلی۔" قیم پھر سوچ میں پڑ گیا۔ "خیر دیکھی ہوگی مگر بہت دن ہو گئے کچھ یاد نہیں آ رہا۔ بس وعدہ دے دیا تھا ساقش ذہن میں ہے۔"

"مگر مجھے تو ایک ایک گلی ایک ایک گلی یاد ہے۔"

"تم سچ میں آتے رہے ہو گے۔"

"نہیں یاد" ارشد خاموش کے لیے میں ہوا۔ "خیر ایک دفعہ دیکھی تھیں آئی۔ کئی دفعہ ارادہ کیا مگر پاسپورٹ نہیں بن سکا۔۔۔ آنا تو اس طریقہ سے نکلتا تھا۔"

"تجربہ میرے ساتھ ہوا۔ خیر پاسپورٹ سے اپنے گھر آئے ہم کو ابھی گئے تھے۔"

"اور اس طرح اگلے گھر رہے ہیں۔۔۔ وہاں سے مجرموں کی طرح مفروضہ ہوئے اور اب یہاں چوروں کی طرح داخل ہو رہے ہیں۔"

قیم اس بات پر صوف کا۔ "خیر کسی نے بچان لیا تو۔"

"جہیں کون بچائے گا؟ گاؤں سے چلے سکول۔ سکول سے نکلے پھر گاؤں میں۔" حکم تو بچانے کا سیکھتے ہو۔"

"میں۔۔۔ نہیں یاد۔۔۔ کون بچائے گا۔ جب میں یاں سے چلا ہوں تو میں بھی نہیں بچتی تھی۔ اب یہ حال ہے کہ ایک دن شیونہ کوں لگتا ہے کہ جیتو جیتو نے انڈے دے ڈالے ہیں۔ اب تم خود سوچو تو۔" اس نے اس لہجہ میں کہا۔ "مجھے یہاں اب کون بچائے گا۔"

ایک شخص چھوٹی ہانڈ سے ایک ہاتھ میں گزوی لئے دوسرے سے دانتوں میں مسواک کرتا پیچھے چلتا آ یا اور برابر سے گز گیا۔
 دونوں صلف کرکھڑے ہو گئے۔ "کون تھاپا دی؟"

"پتھیں کون تھا؟" نعیم نے تھوئیں ہرے لہجہ میں کہا۔ اس کے قدموں کی ڈرامائی آہٹ نہیں سنائی دی۔"

"کیا وہ ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا؟"

"گنا تو جیسا ہے اور پتھیں کہاں سے پیچھے لگا چلا آ رہا تھا؟"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔"

"گھبرا رہے گئے۔"

دونوں ایک دوسرے کا دست جتنے گئے۔ آنکھوں میں خوف اور پاؤں سوسن کے جیسے زمین نے قدم پکڑے ہوئے۔

"خوار شدہ" ہال آف فیمین بولا۔ "آگے جانے میں مضبوط ہے۔"

"پھر؟"

"پلٹ جائیں۔"

ارشاد سوجی میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ "تھوڑی دور چل کر دیکھتے ہیں کہ یہ آدی کرتا کیا ہے؟" دونوں آہستہ آہستہ بے پاؤں چلے۔
 گزوی والی آدی ابھی غاصی دور داخل کیا تھا۔ وہ آگے آگے اور پیچھے پیچھے جیسے تھپتھپ رہے تھے۔ سینے کے ہٹنے کے پاس پتلی کر وہ
 سڑک سے اتر کر بنیائیں مڑ گیا۔ ارشد نیز قدم اٹھا کر بنیائے کے گیت پر پہنچا۔ وہاں کھڑے ہو کر وہ گزوی والے آدی کو دیکھتا رہا۔ یہاں
 تک کہ وہ درختوں میں اوجھل ہو گیا۔ گزوی والے آدی کا مد نظر تک قلاب کر کے لگا ہیں وہاں آئیں اور ارشد کا ایک اوپنے درخت کی
 شاخوں پر مرکوز ہو گئیں۔ اس نے اگلی غصا میں لہرائی۔ "یہ نعیم"

"کیا؟"

دو کچھ کہتے۔

نعیم کی لگاؤں بھی اس اوپنے درخت پر جائیں جو سفید سفید گول گول ککھوں سے لہلہا کھڑا تھا۔

"خوار شدہ درخت سے میں نے بہت سے ککھے توڑے ہیں۔" ارشد بولا۔ "ککھے کا درخت اپنے گاؤں میں اس سے بھی اونچا

ہے۔ اور اس پر بہت کچھ لگتا تھا۔"

دونوں کھڑے رہے اور اونچی شاخوں میں سفید کرکے کی گیندوں جیسے ککھوں کو لہراتے دیکھتے رہے۔ ایک کا کاکیں کا کاکیں کرتا
 ان کے اوپر سے گزرا چلا گیا۔ اور ارشد جیسے خواب سے وہاں آ گیا ہو۔ "اچھا پارا جیٹیں۔" اور دونوں کے قدم خود بخود آگے کی طرف
 اٹھنے چلے گئے۔

"پارکمال ہے یہ درخت دنیا کا دیرپا سفید کھڑا ہے۔"

"ککھے کی عمر بہت ہوتی ہے۔" نعیم نے کہا۔

"عمر کی بات کرتے ہو تو پھر جلی حویلی چلو وہاں میں جسیں دکھاؤں گا ککھ کی عمر بتاتی ہوتی ہے۔ اہر کے اعلا میں ایک بڑھ ہے
 اس کی ڈاڑھی زمین کو چھو رہی ہے۔ ہمارے بڑے ابا کہا کرتے تھے کہ یہ ہاتھ بڑھ کے ڈالے کا بچہ ہے۔"

"پھر تو بہت عمر ہوگی۔"

"ہاں بہت پرانا ہے اور اتنا کھٹا کر بچا کھک دو پہری میں بھی اس کے نیچے اندر جھرا رہتا تھا۔" اور ارشد کے قدم غیر شعوری طور پر
 تیز تر اٹھنے لگے۔

"تمہارے بڑے ابا زندہ ہیں؟"

"نہیں وہ جب ہم بچے ہی اللہ کو یاد کرے ہو گئے تھے۔"

"گھبرا جلی حویلی میں کون ہے؟"

"جلی حویلی میں اب کون ہے؟" وہ صلف کیا۔ سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "ہاں یاد آ رہا ہے اب ہم وہاں سے چلے تھے تو جلی حویلی میں نعیمی
 اس کو بٹھاوا تھا اور نعیمی اس بٹھاوا میں جس بھی جلی ہوئی گی۔"

"یہ کتنی دور چلتا ہے؟"

"بہن آگے ہیں = یہ اوپر کوٹ ہے۔ یہاں سے نکل کر بسا میں کی گلی ہے۔ بسا میں کی گلی سے اگلے ہی سامنے جلی حویلی
 ہے۔" اور ارشد کے قدم پھر تیز اٹھنے لگے۔

ابا اب اچھا خاصا ہو گیا تھا سرورج نے ابھی اپنی صورت نہیں دکھائی تھی۔ اوپر کوٹ کی دکانیں ابھی بند پڑی تھیں۔ مگر اولاد
 کو دی فکر نے دکان کو لی تھی۔ جہاز وہ پانچ گھر کر رہے تھے لالہ کو دی فکر جیسے تب تھے وہی ہے اب ہیں اور یہ تصور تو ہی پرانی
 ہے۔ اور وہی سے کالے کوسوں ٹرین بن گئے ہوئے دو بن باقی جتا کی سکت سے عزم جسے بن نے نکل لیا۔ "لالہ کی مٹے۔" اس

کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور پھر وہ مضحک کیا۔ ارشد اور نعیم دونوں کا سانس اوپر رکا اور پھر کا اوپر مارے کچے کچے لالہ نے جھاڑوں سے رنگ لگے کھن کے ذریعے پھینچے اور منگیاں جھاڑے جھاڑے سے تعلق سے اسے دیکھا جسے کیا اور اپنے کام میں لگ گئے۔ ارشد اور نعیم دونوں نے زمین کا سانس لیا اور آگے بڑھ گئے۔ پھر پھر ارشد کچھ دواں ہو گیا۔ میں سودا پیشہ لڑکی دکان سے خریدتا تھا ان میں کئی کئی بھیرے لگا تھا اور ہر بھیرے پر لکھا ذکر جاتا تھا۔ اب لالہ مجھے پچھان ہی نہیں۔

اوپر کوٹ سے نکلے تھے اس نے دیکھا کہ لالہ دکان اور یہی محل کی ہے۔ سفیدی ڈاڑھی والے صادق عطار کو اس نے دور ہی سے پہچان لیا تھا مگر احتیاط سے گزرا کرتا تھا۔ یہی صادق عطار نے اسے گزرتے ہوئے دیکھا ضرور تھا مگر آتش پانہ نغروں سے۔

بسا اسی کی گل میں داخل ہوتے ہوئے اس نے اعلان کیا کہ "لو بھی اب کمر آ گیا۔ اس گل سے نکلے ہی چلی ہوئی ہے۔ اس گل میں پہلے ہونے اس نے اپنے لیے بے قدم اٹھا لیے جیسے بس دو دو گلوں میں گل کو پار کر جانے کا۔ نعیم کو کئی پار کی قدر وادار کے برابر آؤنگی اسے عزت ہوئے اس نے اعلان کیا کہ "سامنے جو دو منزل عمارت نظر آئے کی بس وہی چلی ہوئی ہے۔ گل سے عزت کر جب باہر نکلا تو اس نے ایک شوق بھری نظر سامنے ڈالی اور مضحک کیا۔

"ارے"

"کیوں کیا ہوا؟" نعیم نے اس کی حیرت کو دیکھتے ہوئے ایک لمحے کے ساتھ پوچھا جب ارشد کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو اس طرف نور سے دیکھا جس طرف ارشد کی نظر رہی ہوئی تھی۔ یہاں سے وہاں تک خالی میدان جہاں جہاں پڑی ہوئی پرانی چھوٹی اشٹوں کے ڈبیرے ایک طرف بے نیچے طریقے پر رکھوا ہوئی تھی اور ایک ایک کو نہ جس پر کتے سے دوکوں کے نشان بنے ہوئے تھے۔ "تمہاری چلی ہوئی کہاں ہے؟"

"نیکو تو میں سوچ رہا ہوں۔" ارشد بڑبڑایا۔

"تم ملو تو نہیں آگے؟" نعیم سوچتے ہوئے بولا۔

"فلا؟" انھیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ "چپ ہو کر حیرت بھری نظروں سے خالی میدان کو دیکھتا رہا۔ بڑبڑایا۔ "مدا ہوئی۔" سامنے سے ایک شخص کے بڑے چڑچڑا ہوا ارشد اور داڑھی اس کی کھنی اور کمر تپتے ہوئے تھا چلا آ رہا تھا۔ ارشد تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ "سنئے جناب یہاں چلی ہوئی جنہی آؤ کہاں گئی؟"

"چلی ہوئی؟" ڈاڑھی والا آدمی رکا۔ پھر بولا۔ "اچھا اچھا چلی ہوئی۔ میں اس وقت بہت دن ہوئے ڈھکی۔"

"ڈھکی کئی..... اچھا؟"

"ہاں اور کیا۔ اب اس میں رو کیا گیا تھا۔ کھنڈر کھڑا تھا۔ برسات نے زور ہاندھا تو اڑاڑا ہوا ہم کر کے لپچے آ رہی۔"

"اچھا؟" ارشد کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کہے۔ پھر ایک ایک بولا "اور تمہی اماں؟ وہ کہاں گئیں؟"

"نہی اماں؟ کون نہی اماں؟"

"نہی اماں۔ وہ بڑی بی بی چلی ہوئی میں رہتی تھی۔"

"اچھا وہ بڑی بی بی جو رانگی ہی تھی۔ آپ لوگ ان سے ملے آئے تھے؟"

"جی ہاں۔"

نعیم تیزی سے آگے آیا اور اس نے ارشد کے بیان کو کافی جان کر ایک قابل قبول وجہ کی کوشش کی "مولا ثابت یہ ہے کہ انہار تو پہنچی میں کا رہا رہا ہے۔ کاروبار کی سلسلہ سے پنڈہ جا رہے تھے۔ رستے میں اتر پڑے کڑھی اماں سے ملے پھیں وہ انہاری رشتہ کی دانی ہوتی ہیں۔ یعنی انہاری دانی اماں کی نظری بہن ہیں۔ چلی ہوئی کا پتہ انہار سے پاس تھا۔"

"عزیز چلی ہوئی ڈھکی کئی اور بڑی بی بی اللہ کو بھاری ہو گئیں۔"

"اچھا؟.... مر گئیں؟...." ارشد کے منہ سے نکلا۔

"ہاں اور ان کے سر نے کے بعد چلی ہوئی ایک شرابی کو ملا کہ ہو گئی تھی۔ وہ کاروبار کے پھر میں پنڈہ چلا گیا۔ ایک دفعہ آ کر ملے صاف کر گیا۔ اس کے بعد اب تک اس نے خبری نہیں لی ہے۔"

"اچھا تو انہاری چلی شرابی کو ملا کہ ہو گئی تھی۔" ارشد سوچتے ہوئے بولا۔ آگے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ نعیم نے جلدی سے کہا "اچھا مولا آپ کا گھر ہے اور ارشد کو پتہ وہاں سے چلنا۔ چلتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ "اب یہاں سے جلدی سے نکل چلو۔" اور اس کے قدم تیز تر اٹھنے لگے۔

"ارشد تمہارے کیا بات ہے؟" ارشد بولا۔

"نعیم نے ارشد کی بات کو کافی جواب نہیں دیا۔ وہ تیز چلا رہا تھا اور اس کی وجہ سے ارشد کو بھی تیز چلنا پڑ رہا تھا۔ "اب کس طرف مڑنا ہے؟" موز پر ہلکی کر نعیم نے سوال کیا۔ ارشد نے ارد گرد نظر ڈالی۔ کچھ لکھا۔ "یہ کونسی جگہ ہے۔" پھر پوچھا۔ "میں بس اسی دلی گلی

ی سے آئے ہیں؟

"بہائیوں والی گلی؟.... بہائیوں والی گلی ہوگی مجھے تو یہاں کی بچکان نہیں ہے۔" ارشد نے پھر ارد گرد نظر ڈالی۔ پریشان ہو کر بولا۔ "چہ نہیں کوئی گلی میں نکل آئے ہیں۔" پھر سوچ کر بولا۔ "خیر کوئی بات نہیں۔ آگے چلتے ہیں۔ خود پتہ چل جائے گا کہ ہم کہاں ہیں۔"

دووں چلتے رہے۔ پھر ارشد روک کر کھڑا ہو گیا۔ "یار چہ نہیں چل رہا کہ ہم کہاں ہیں؟ ہم رستہ بھول گئے ہیں۔" نعیم نے کہا۔ ارشد نے نعیم کو فیس سے دیکھا۔ "یہاں کے رستے میرے کونہ سے ہوئے ہیں۔" سامنے ایک چائے کی دکان کھلی تھی۔ چوہا گرم تھا اور کھیتی کی ٹوٹی سے سفید سفید بھاپ نکل رہی تھی۔ "آؤ چائے پیتے ہیں۔" نعیم نے کہا۔

"پیو؟" ارشد نے سوال اٹھا دیا۔

"دوہی ہو جائیں گے۔"

دووں چائے کی دکان میں داخل ہو کر الگ الگ ایک کونے میں جا بیٹھے۔ چٹائی پر بیٹھے چہنچہ ارشد نے دکان کے دروازے اور فورے دیکھا۔ "یہ کوئی نئی دکان کھلی ہے۔ پہلے تو تھی نہیں۔"

ایک میٹل کیکے لڑکے نے چائے کا آؤ ڈالیا اور نئی بنائی چائے کی دو بیڑیاں لا کر رکھ دیں۔ ارشد جوگی کے درخ جیٹا تھا چائے پیتے پیتے چوٹا۔ "دو گھنٹے جا رہا ہے۔"

"کون گھنٹے؟"

"جس سے ہم نے پہلی ہوئی کے بارے میں پوچھا تھا۔"

"پچھلا دھولا؟.... چلا گیا؟" نعیم نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں ابھی گزرا ہے۔"

"اس نے اور دیکھا ہی نہیں۔"

نعیم کئی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر چائے پیتے پیتے بولا۔ "واقعی اس نے ہماری طرف نہیں دیکھا تھا۔"

"میرا خیال تو یہی ہے کہ اس کی نظر ہم پر نہیں پڑی۔" جس کی ایک ہوا ہے؟

"یار مجھے لگتا ہے کہ اس گھنٹے کو ہم پر لکھ پڑ گیا ہے۔"

"تم نے کیسے جانتا؟"

"تم نے کیسے جانتا؟"

"بات یہ ہے کہ تم تو اس وقت اپنے ہوش میں نہیں تھے۔ میں اس گھنٹے کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا۔ اس نے جسیں بڑے نور سے دیکھا تھا میرا خیال ہے کہ اس نے جسیں بچکان لپکا تھا۔"

"مجھے؟" ارشد سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ "نہیں یار جس دکانداروں سے میں سودا خریدتا رہا ہوں انہوں نے مجھے نہ بچکانا تو یہ گھنٹے میں جانتی ہی نہیں تھے کیسے بچکان لپکا تھا؟"

"ممکن ہے یہ میرا گھنٹہ ہم ہو۔" نعیم نے تذبذب سے جواب دیا۔

"ہاں یہ محض تمہارا گھنٹہ ہے۔"

دووں چپ ہو گئے اور خیالوں میں کھو گئے۔ پھر ارشد بولا۔ "خیر تھا تو وہ مسلمان ہی۔ اسے فلک ہوا بھی ہوگا تو طرح دے جائے گا۔"

"اتنا کچھ دیکھنے اور سننے کے بعد بھی؟"

ارشد چپ ہو گیا۔ سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "میں اس واقعہ کو کچھ اور طرح دیکھتا ہوں۔"

"کس طرح؟"

"مسلمان ہونے کے باوجود وہارے دوران کے دور میں ان کا قافلہ بہت تھا۔ زبان کا قافلہ تہذیب کا قافلہ۔ ہم نے اس قافلے کو پائے اور انہیں جاننے کی کوشش نہیں کی۔ نہ انہوں نے ہمیں جانتا نہ ہم نے انہیں بچکانا۔"

نعیم غلطی سے جی ہنسی "ہائل ہائل قافلے تو ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ان کی زبان ایک تھی۔ ان کی تہذیب ایک تھی پھر کیا ہوا؟"

ارشد لا جواب ہو گیا۔ نعیم کو خاموش کھتا رہا۔ پھر اچانک بولا۔ "مجھے خیال پڑتا ہے۔ کہ میں اسے جانتا ہوں۔"

"کسے؟"

"اے۔ مولوی کو۔"

"اچھا؟"

"ہاں مجھے کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ میں نے اسے دیکھا ہے.... ہاں بالکل... اسے تو میں دیکھتا رہا ہوں۔ مسجد کے برابر مکان

میں رہتا تھا۔"

"اچھا؟" فہم کس میں آیا۔

"دو دنوں ایک طرف کے عالم میں ایک دوسرے کو سمجھ رہے۔ ہر فیصم نے چپکے سے کہا۔" یہیں زیادہ دیر بیٹھا فہم نہیں۔"

اور جیسے ارشد اشارے کا منتظر تھا۔ دونوں دھٹکا اٹھ کھڑے ہوئے۔

گلی سے تیز چلے۔ سوز سڑک پر آ گئے۔ اس کشادہ سڑک پر آ کر انہیں یوں لگا جیسے وہ شطرنج سے نکل آئے ہیں۔ ان کی مضطرب چال میں ایک اطمینان کی کلیجیت پیدا ہوتی چلی گئی۔ گلی پیچھے رہ گئی تھی۔ اس صوباری اور چڑی سڑک پر وہ مطمئن چل رہے تھے۔ ہر فیصم نے سادگی سے پوچھا اور اس موقع کے ساتھ کہ جواب اشاث میں آئے گا۔ "یہی سڑک ہے؟"

"کوئی سڑک؟" ارشد صلف کیا۔

"تیس سڑک سے ہم آئے تھے۔" ارشد نے سڑک کو دور تک ایک حیرت کے ساتھ دیکھا۔ "یہ کوئی سڑک ہے۔" پتلے دھڑکیں تو اچھا ہے۔" فہم نے کہا۔ وہ کسے قدم بھرنا لگے۔

دور یہ ایک سی رنگت اور ایک سی لڑائی کے ایک منزل والے مکان اور تک پہنچے کچھ کر فہم نے کہا۔ "مجھے تو گنا ہے کہ یہ کوئی نئی کالونی ہے۔"

"نئی کالونی تو ہے مگر میں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ سڑک کوئی ہے۔"

"سڑک بھی شاید نئی ہو۔"

ارشد ایک حیرت کے عالم میں چلا رہا۔ ہر کھڑا ہو گیا۔ "یہ سڑک میرے قدموں کو لگتی نہیں۔ تم نے فہم کہا۔ یہ کوئی نئی سڑک نئی ہے۔"

"پھر؟"

"پلٹ جائیں۔ جو سڑک قدموں کو نہ لگتی ہو اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ پتہ نہیں کہاں لے جائے۔"

دونوں پتلے جس رستے آئے تھے اسی رستے واپس چلے گئے۔ فہم بولا۔ "کسی سے رستہ پوچھ لیں۔"

"یہ سڑک کتنی نئی اس لئے مجھے اٹکل نہیں پڑی ہوتی تو یہ سب رستے میرے کھوندے ہوئے ہیں۔" ارشد احتاد سے قدم اٹھاتے ہوئے سوز سڑک اب دو دنوں ایک گلی میں تھے۔ دور یہ وہ منزل اور سڑک مکان۔ چہ ہارے کچھ اٹکے ہوئے وہاں اب گے اور اب

مگر سے کچھ نئے نئے رنگ کئے ہوئے ڈیجیٹل لکھنوی کی ہماری کواڑوں والی۔ ڈیجیٹل میں دو دنوں سے کے دائیں بائیں پتھر کی چٹکیاں بنی ہوئیں۔ چٹکیوں میں طاق کہ وہ میں سے سیاہ پڑ گئے تھے اور کسی کسی طاق میں جھکا ہوا اور لکھا ہوا مگر داس کے سبب دور بکھرا ہوا۔ "یار یہ تو ہندوؤں کی گلی ہے۔" اور فہم نے ارشد کی تشویش کا جواب بے اعتنائی سے دیا۔ "اب ہمارے لئے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ گلی ہندوؤں کی ہے یا مسلمانوں کی۔" جیسے کوئی وہم سے کوہ اور دونوں کے دل اچھل کر مطلق میں آ گئے۔ کوئی نہیں یار بند رہے۔" دوسرے ہی لمحہ دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور ایک دوسرے کا حوصلہ بندھا یا۔ اجڑے ہالوں والی موٹی سی بندر یا پٹے کوٹنے سے چھانے لگی کہ جو کمرہ رچی تھی۔ ایک کے میں ہائی کے سہارے چڑھ کر مندر پر چٹکی اور مندر پر کھانچا لگا کھانچا ہو گئی۔ بندر یا کو کچھ کر سانس میں سانس آیا مگر دل تھے کہ جھکے ہمارے تھے۔ اس کنارے سے اس کنارے تک گلی خالی پڑی تھی۔ چہ ہارے بھی اور جیسے بھی قدم کہ اب تک تیز اٹھے تھے اب کسی قدر سے لرز رہے تھے اور آہستہ اٹھ رہے تھے۔ عقب میں دور کہیں دور دو دنوں سے نکلا۔ کیلیے ہر حرکت کو آگے۔ مگر اب ان میں پیچھے سڑک کو کھینے کا حوصلہ نہیں تھا۔ پاؤں تھے کہ سوسن کے ہو گئے اور گلی پھیل کر کسی ارادے کی جنگی کائنات دست بن گئی۔

بے انت ذرا فانی گلی سے شہم بھٹم لکھتے سانس میں سانس آیا۔ بھری ملک کے ساتھ ایک بچے کو سوز والے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر ارشد نے کھو لیا تھا کہ اب مسلمانوں کی گلی شروع ہوئی ہے۔ اس کے قدم اطمینان کے ساتھ اٹھنے لگے۔ یہی ایسی نہیں تھی چار قدم چلے ہوں کہ فہم ہو گئی اور اس طرح کہ آگے کی ایک بچی کی دھڑکتی رو کے کھڑی تھی۔ یار یہ تو اندھی گلی ہے۔" اور وہ پلٹ پڑے۔

اندھی گلی کے لٹکے لٹکے ارشد کو کھڑا ہو گیا۔ "یار فہم۔"

"ہاں؟"

"یار میں واقعی رستہ بھول گیا ہوں۔"

دونوں نے کسی کے ساتھ ایک دوسرے کو سمجھنے لگے۔ ہر فیصم بولا۔ "پھر کسی سے پوچھ لیں۔" "ہاں اب کسی سے پوچھنا ہی پڑے گا۔" ارشد نے فکرت غور و آواز میں کہا۔

دور سے ایک شخص کو آتے دیکھ کر ارشد نے کہا "اس سے پوچھتے ہیں۔" اور وہ اس کی طرف تیزی سے پکا۔ مگر جب وہ شخص قریب آیا تو ارشد نے اسے غور سے دیکھا اور صلف کیا۔ گزرتے ہوئے شخص نے بے اعتنائی سے دیکھا اور گرا جلا گیا۔

افسانے یوں ہیں چلے جیسے بھاگ رہے ہوں۔ قدم ان کے آگے کی طرف اٹھ رہے تھے اور کان پیچھے کی طرف گئے ہوئے تھے۔ ایک فیصلی آواز ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ پھر انا کا کھلتے دروازے کی آواز اور دونوں اور مردوں کی ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ آوازیں۔ اور انہوں نے کچھ بھانٹنا شروع کر دیا۔

"ارے یہ تو ہم بھڑوہیں آ گئے۔" انہوں نے قہقہے سے ارد گرد دیکھا۔ وہی خالی میدان ایک سمت پر اپنی لنگڑیائیتوں کا طہرستان ہوا ایک طرف داخلی ہوئی راجا کا وہی تختہ کنارہ جس پر کونے سے کونوں کے نشان بنے ہوئے تھے۔ اب میدان میں دھوپ پھیل چکی تھی۔ کچھ لڑکے قہقہے اور سرگرمی سے کرکٹ کھیل رہے تھے۔

ارشاد میدان میں جہاں وہاں پر سے بٹنے کا احتیاط سے دیکھنے لگا۔ شقت راجا تک گیا۔ غور سے اسے دیکھا۔ واپس ہوا۔ ادھر ادھر دیکھتا ہوا کچھڑا صحنہ بنا ہوا۔

"کیا دیکھ رہے ہو یا۔ بس یہاں سے چلو۔"

"دیکھ رہا ہوں کہ وہ جگہ کہاں گیا؟"

چلتے چلتے ٹھوکر کا ایک کتے ہوئے بلی کی جڑ نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اسے ٹھکلی ہانڈ سے دیکھتا رہا۔ بڑبڑایا۔ "یہ بھی کتہ کیا۔" پھر نعیم سے خطاب ہوا۔ "نعیم یہ تھا وہ بڑا جس کی میں بات کر رہا تھا۔" پھر اسے نکلتے نکلتے وہیں پڑ گیا۔ "یار کھک گئے۔" جلدی جائیں ڈرا۔

نعیم نے تامل کیا۔ پھر بولا۔ "میں اس صورت سے ڈرا ہوا ہوں یہاں سے نکل چلتا چاہئے۔"

ارشاد نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ ارد گرد کے منظر میں گم تھا۔ دھوپ اب ابھی خاصی ٹھنکی آئی تھی۔ کبرہ چھٹ چکا تھا۔ مگر وہاں ٹھنکی تھی۔ وہ دھوپ سینک رہا تھا۔ اور میدان میں پھیلے منظر کو دیکھ رہا تھا۔ انٹوں کے کھڑکوں کو نوئی راجا کو کرکٹ کھیلنے لڑکوں کو۔ یہ منظر دیکھتے دیکھتے وہ آہستہ سے ریت گیا۔ دھوپ میں نہاتی ہوئی فضا کو روشن آسمان کو چٹ لینا دیکھا گیا۔ پھر اس کی آنکھیں منہ نے لگیں۔

نعیم نے برآے جاتے آدلی کو ایک اندیشہ کے ساتھ دیکھا۔ ہر مرتبہ اس کے گزر جانے کے بعد سوتے ہوئے ارشد کو دیکھا۔ کئی مرتبہ کھانا کھا کر اس طور ارشد کی آنکھ کھلی تو اسے سوچا۔ ارشد نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ نعیم کو دیکھا۔

"دن اچھا خاصا چڑھ چکا ہے۔ اب یہاں سے جلدی لگنا چاہئے۔"

ارشاد نے جواب میں آنکھیں ملیں۔ ایک لمبی بھائی یا پھر دھوپ سے جھگڑاتے آسمان کو دیکھنے لگا۔ وہ دھوپ سے جھگڑ کر تے آسمان کو دیکھتے دیکھتے چلے پھر پھل ہونے لگے۔ "یار دھوپ آج بہت اچھی ہے۔" اور نعیم پھر منہ تپتی چلی گئیں۔



شہر افسوس

پہلا آدمی اس پر یہ بولا کہ میرے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں کہ میں مر چکا ہوں۔ تیسرا آدمی یہ سن کر چلا نکلا اور کسی قدر خوف اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا مگر دوسرے آدمی نے کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ حرارت سے خالی ہات اواز میں پوچھا۔ "تو کیسے مر گیا؟"

پہلے آدمی نے اپنی بے رونق آواز میں جواب دیا۔ "وہ اک سالوں کی رنگت والی لڑکی تھی ماما مجھے پر لال بندھی لڑکیں کمر کر۔ ایک سالوں کو جو ان اس کے ساتھ تھا۔ میں نے تو جو سے پوچھا یہ تیری کون ہے۔ بولا یہ میری بہن ہے۔ میں نے کہا کہ تو اسے برہنہ کر۔ یہ سنا تو لڑکی پیدہشت طاری ہوئی۔ چنانچہ وہ اسے لڑنے لگا۔ تو جو ان نے فریاد کی کہ ایسا مت کہہ کر یہ میری بہن ہے۔ مجھ پہ بھی دہشت سوار تھی۔ میں نے نیام سے نکواڑ نکال لی اور چلا گیا کہ تو اسے برہنہ کر۔ برہنہ کرنا کہ تو جو ان خوف سے ہراساں ہوا۔ پھر ایک سال کے ساتھ اس کے لڑنے لگا۔ پھر بہن کی سادھی کی طرف بڑھے اور اس سالوں کی لڑکی نے ایک غوف بھری چیخ ماری اور دونوں ہاتھوں سے منہ صاف کیا۔ اور ان لڑتے ہاتھوں نے میرے سامنے....."

"تیسرے سامنے؟....." "ہاں....." "تیسرے آدمی نے حیرت سے دوسرے آدمی سے تیسرا آدمی کو بیکسر فرماواں کیا اور اپنے اسی ہڈے سے صرا جھ میں پوچھا "پھر تو مر گیا؟"

"نہیں زندہ رہا۔" اس نے بے ہنگام آواز میں کہا۔

"زندہ رہا؟....." "اچھا؟....." "تیسرا آدمی حریفہ جہان ہوا۔

"ہاں میں نے یہ کہا نہیں نے یہ دیکھا اور میں زندہ رہا۔ میں یہ دیکھنے کے لئے زندہ رہا کہ اس نو جوان نے وہی کیا جو میں نے کیا تھا۔ دہشت میں جمائی ہوئی ایک برقعہ پوش کواں نے دیو بیچ لکھا تھا۔ ایک بوڑھے آدمی نے زاری کی اور چلا گیا کہ اسے جان ہماری آبرو پہ دم کر۔ سناوے تو جو ان نے لال پٹی اٹھروں سے اسے دیکھا اور پوچھا یہ تیری کون ہے۔ وہ بوڑھا جوا لہجے یہ میری بہن ہے۔ اس پر سناوے تو جو ان نے دانت لکچا لے اور چلا گیا کہ بوڑھے تو اسے برہنہ کر۔ یہ سنا تھا کہ وہ لڑکا نہایت جوا لہجے آدمی ایک دم سے سن

ہو گیا اور دہشت میں اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ تب تو جو ان مجھے سے دوجا ہوا اور بوڑھے کی گردن بکڑ کے چلا گیا کہ بوڑھے اپنی بھوک پر بند کر....." اس نے یہ کہا اور میں....."

"اور تو مر گیا؟" "تیسرے آدمی نے جلدی سے یہ سنا کہ ہو کر کہا۔

"نہیں میں زندہ رہا؟....." "اچھا؟....."

"ہاں میں زندہ رہا میں نے یہ سنا میں نے یہ دیکھا اور میں زندہ رہا۔ اس خوف سے کہ وہ سناوے تو جو ان مجھے بچان نہ جائے۔ میں نے وہاں سے روافرا اختیار کی۔ مگر میں اسے کافی کرنے میں آگیا۔ میں نکواڑ بچنے لگا تھا کہ ایک پریٹان حال شخص مج پر کمر سے رو بہ آ گیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ تلو ارست چھپک پتا نہیں جہاں مرادی کے خلاف ہے میں مصلحت گیا۔ میں اسے بچنے لگا وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے ڈال کر تھا۔ پھر میری نگاہیں جھک گئیں۔ میں نے ہار کر کہا کہ زندہ رہنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے۔ اس کام سے اس کی آنکھوں سے ہٹے پرہنے لگے۔ اس نے حکارت سے میرے منہ چھو کا اور واہیں ہو گیا۔ میں ان وقت ایک نکواڑ اس کے سر پہ پھٹی اور وہ تورا کر زمین پر گرا۔ میں نے اسے اپنے گرم لہو میں ات پت دیکھا اور اپنے چہرے سے اس کا گرم لہاب پوچھا اور....."

"اور تو مر گیا؟" "تیسرے آدمی نے اپنی دانست میں اس کا فقرہ مکمل کیا۔

"نہیں۔ میں زندہ رہا۔ میں نے اپنی نکواڑ چار کھادی اور میں زندہ رہا۔ مگر نہ جانے کس طرف سے وہ سناوے تو جو ان پھر سواوار ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر مصلحتاً قریب آ کر مجھے گھورنے لگا۔ پھر فرار کر پوچھا کہ کیا تو وہی نہیں ہے۔ میں نے بعد ازل اعتراف کیا کہ ہاں میں وہی ہوں۔ یہ سن کر وہ تیزی سے رخصت ہوا اور میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد وہ واہیں آ گیا۔ اس رنگ سے کہ ایک لڑکی کو کچھتا ہوا میرے سامنے لایا۔ اس خاک میں اتنی بکھرے بالوں میں مچی صورت کو میں نے غور سے دیکھا تو سناوے میں آگیا۔ اور اس نے مجھے دیکھا تو اس دور سے روئی کہ میرا عجربرت گیا۔ سناوے تو جو ان نے زہر بھری آواز میں مجھ سے پوچھا یہ تیری کون ہے۔ میں نے تالی کیا۔ آفریتا یہ کہ یہ میری بیٹی ہے۔ سناوے تو جو ان نے فشی القاب بن کر کہا پھر تو اسے برہنہ کر یہ سن کر خوف سے اس مصدم کی کٹھی بندھ گئی اور اصر میں بڑھے گیا اور....."

"اور تو مر گیا؟" "تیسرا آدمی بے تاب ہو کر بولا۔

"نہیں....." "وہ نکا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "میں زندہ رہا۔"

"زندہ رہا؟"۔ اس کے بعد بھی..... اچھا؟..... "تیرا آدمی کب تک نہیں آگیا۔"

"ہاں اس کے بعد بھی۔ میں نے کہا میں نے سنا میں نے دیکھا میں نے کیا اور میں زندہ رہا۔ میں وہاں سے منہ چھپا کر بھاگا۔ پچھتا پچھتا غراب دھندلے ہو کر اس کوپے میں پٹپٹا۔ جہاں میرا گھر تھا۔ اس کوپے میں خوف کا قیرا تھا۔ اب دلوں وقت مل رہے تھے اور یہ کہ چوکھٹام پڑے یہاں غراب چل چل ہوئی تھی۔ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ میری گل کاکتا۔ کچل کچل منہ اٹھانے اور سامنے نظریں گاڑے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر فریاد سختی بہت جاتی تھی۔ آگے جب میں گل میں داخل ہوتا تھا وہ ایک بانوں ادا کے ساتھ دم جاتا تھا۔ آج مجھے دیکھ کر جب طوطے سے چوٹا ہوا۔ ہال سارے جسم کے کھڑے ہو گئے۔ آہستہ آہستہ فریاد اور دھندلے میری نظروں سے مجھے گھورنے لگا خوف کی ایک لہر میرے بدن میں تیرتی چلی گئی۔ میں اس سے ڈرنا ہی کر کسی قدر چوکے میں کے ساتھ گڑا چلا گیا۔ اور اپنے دروازے پر پٹپٹا۔ دروازہ اندر سے بندھا۔ میں نے آہستہ سے دھک دی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ گنگنا تھا کہ کمر میں کوئی ہے ہی نہیں۔ میں نے قہقہہ کیا کہ کوئی قدر زور سے دھک دی۔ پھر وہی خاموشی۔ ایک نئی برابر کے مکان کی پست منڈیر پر گزرتے گزرتے شخص ایک اجنبی بھری بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور ایک دم سے لٹک گئی۔ میں نے اس مرحلہ تک دینے کے ساتھ آہستہ سے آواز بھی دی "کھولو۔ اندر سے کس سے نسوائی آواز آئی" "کون" میری منکوح کی آواز تھی۔ اور مجھے قہقہہ ہوا کہ آج اس نے میری آواز کو نہیں پہچانا۔ میں نے احماد کے ساتھ کہا کہ میں ہوں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا مجھے دیکھ کر کسی آدمی میں ہوئی "تم؟" میں نے دھمکی ہوئی آواز میں کہا کہ "ہاں میں۔" میں اندر آیا۔ گھر ہو کر رہا تھا۔ اندر باہر اندھیرا تھا۔ برآمدے میں ایک دم سم کوٹا دیا غصا رہا تھا۔ وہاں مٹلی پچھا تھا اور میرا باپ خاموشی سے قہقہہ بھیر رہا تھا۔ میری منکوح آہستہ سے ہوئی۔ "میں بھی جی کر شاہ میری بیٹی واپس آگئی ہو۔" میں نے گھبرا کر اسے دیکھا کہ کیا اسے خبر ہو گئی ہے۔ وہ مجھے نکلے جا رہی تھی اور مجھے نکلے جیسے تھے اس کی چلتی بھر گئی ہوں۔ میں اس سے آگے نکلا تھا کہ برآمدے میں باپ کے پاس پہنچا اور مٹلی کے برابر زمین پر دوڑا تو وہ بیٹھا۔ باپ نے دیا تھا میں اٹھا کر مجھے غور سے دیکھا "تو؟" "ہاں میں۔" اس نے میرے سر سے ایک حیرت سے دیکھا "تو زندہ ہے؟" "ہاں میں زندہ ہوں۔" اس چراغ کی دھم دھم روشنی میں مجھے گلے گلے ہاتھ دے دیکھا رہا۔ مجھے اعتباری کے لیے میں ہلا۔ "نہیں" "ہاں میرے باپ میں زندہ ہوں۔" اس نے جھل کیا تو ہمیں بند کس پھر ہلا۔ "اگر تو زندہ ہے تو پھر میں مر گیا۔" اس بزرگ نے ایک لمبا سلفا سا سن لیا اور کہا۔ تب میری منکوح میرے قریب آئی۔ زہر میرے لیے میں ہوئی۔ "اسے اپنے سونے باپ کے بیٹے اور اسے میری آبرو لینی جی کے باپ تو مر چکا ہے۔" تب میں نے ہاتھ کس میں مر گیا ہوں۔"

دوسرے آدمی نے یہ کچھ سننے کے بعد آدمی کو گھور کر دیکھا اور دیکھے کیا اس کے احساس عاری پیرے کو اس کی ہنک سے محروم آگھوں۔ پھر دیکھے لیے میں سلطان کیا کہ "جان مجھے یہ یہ آدمی مر چکا ہے۔"

تیرا آدمی کہ پہلے ہی سے حیرت زدہ تھا حیرت حیرت زدہ ہوا۔ پہلے آدمی کو حیرت اور خوف سے دیکھا کیا۔ پھر اچانک سوال کیا۔ "تیرے باپ کی لاش کہاں ہے؟"

"باپ کی لاش؟" پہلے آدمی کے لئے یہ سوال شاید غیر متوقع تھا۔ دو جھپکا پھر ہلا۔ "وہ تو وہیں رو گئی۔"

"لا لاش کہاں نہیں؟"

"دو لاشیں کیسے لے کر آتا۔ موت چھ کر اپنی لاش کس طرف لپے لے کر آتا ہوں۔"

دوسرا آدمی جس نے اب تک سب کچھ یہ کسی سے کہا اور ساتھ ہی بات سن کر چوکا۔ "ارے ہاں" میں یہ بھول ہی گیا تھا۔ میری لاش تو وہیں رہ گئی ہے۔"

"تیری لاش؟" تیرے آدمی کی حیرت زدہ نظریں پہلے آدمی کے چہرے سے ہٹ کر دوسرے آدمی کے چہرے پر بند کر ہو گئیں۔

"ہاں میری لاش؟" پھر وہ بڑبڑانے لگا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہوں۔ "لاش کو لے کر آنا چاہئے تھا ہانے وہ اس سے کیا سلوک کرے۔"

"تو کیا تو بھی مر چکا ہے؟" تیرے آدمی نے پوچھا۔

"ہاں"

"اچھا؟" تیرے آدمی نے قہقہہ سے اسے دیکھا۔ "موتو کیسے مر گیا؟"

"جو مر گیا وہ کیسے ہاتھ کے کہ وہ کیوں مر اور کیسے مر گیا۔" دوسرا آدمی چپ ہو گیا پھر خود ہی اپنی بے لہجہ آواز میں شروع ہو گیا۔ "اس شہر فرانی میں آفرود ساعت آگئی جو سرور میں منڈلاری تھی۔ میں پچھتا پچھتا تھا اور سوچتا تھا کہ کیا اب ہمارے ساتھ وہ جکھ ہوگا جو ان کے ساتھ ہو چکا ہے۔ ایک بازار سے گزرتے گزرتے ٹھوٹکا۔ کیا دیکھا کہ ایک سانولی لڑکی نے ساڑھی لیر لیر لہریں لہرائیں کہ سارا پانڈ اکھا ہوا ہال پر لیٹان خاک آلودا تھی کہ بندی سلی ہوئی دہلی پتل جگر بیٹھ چکلا ہوا۔ دھشت سے دھڑا دھڑا کھتی دڑنے لگی پھر ٹھہر جاتی۔ میرے قریب سے گزرتی تو میں ٹھٹھ گیا۔ وہ بھی دیکھ کر ٹھٹھ گئی۔ ارے یہ تو وہی لڑکی ہے جسے میں نے

... اور میں اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ اس نے ہاتھوں سے چروا چاہیے ہوئے چٹا مادی "نہیں نہیں نہیں" اور غور و فکر بھاگ پڑی۔ میرے اندر دغون بھنے گا یہ لڑکی مجھے چکروا دے گی۔ میں مت چپا کر بھاگتا ہوں بھاگتا ہوں کسی اس کو بے میں بھی اس کی میں۔ مگر ہر گلی اندھی گلی تھی اور ہر کوچہ بند کوچہ تھا۔ شہر فراہی سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔ اسی طرح مجھے ایک نزلے مگر میں جا لگا۔ لاشیں دور دور تک نظر آ رہی تھیں۔ جیسا آدمی آس پاس کہیں نظر نہ آیا۔ میں حیران و پریشان ایک کوچے سے دوسرے کوچے میں اور ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں گیا۔ بازار بند رستے سنان کو بچے سے دوسرے کوچے میں اور ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں گیا۔ بازار بند رستے سنان گلیوں ویران کسی مکان کے بالائی در بچے کے پتے اٹھتے مگر دوسری کسی آنکھیں نظر آتیں اور پھر جلدی سے پتہ بند ہو جاتے۔ محل حیران تھی کہ کیا مگر ہے۔ لوگ ہیں مگر گھروں میں مقید بیٹھے ہیں۔ آخر ایک میدان آیا جہاں دیکھا کہ ایک غفلت ڈیرا ڈالے پڑی ہے۔ بچے بھاگ سے بچتے ہیں۔ بڑوں کے ہونٹوں پر ہلکا سا مسکراہٹ ہے۔ ہانک کی جھانچاں سوکھ گئی ہیں۔ شاہاب چہرے سر ہجھکتے ہیں۔ گوری حیران سولا گئی ہیں۔ میں وہاں پہنچا کہ اسے کو کو کچھ بتاؤ کہ یہ کیسی جاتی ہے اور اس پر کیا آفت ٹوٹی ہے مگر قید خانے سے نکل کر آئے اور گلی کوچوں میں خاک اڑاتی ہے۔ جراب ملا کہ اسے کم نصیب تو شہر انیسویں میں ہے اور ہم سب بکلت یہاں دم سادے موت کا انتظار کرتے ہیں۔ میں نے یہ سن کر ایک ایک کے چہرے پر نظری۔ ہر چہرے پر موت کی پرچھائیں پڑی تھیں۔ اور ہر چوٹی پر سیدھے نکلی تھیں۔ مجھے انہیں دیکھ کر گھس ہوا۔ پوچھا کہ اسے کو کون سا جتنا آدمی نہیں ہو جہاں جاتی کو دارالامان جان کر اور سے محل کر آئے اور یہاں ہر گھر کے انہیں نے کہا کہ اسے محض تو نے خوب پہچانا۔ ہم انہیں خانہ برہادوں کے قبیلے سے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ خانہ برہادوں تم نے دارالامان کو کیسا پایا۔ بولے کہ خدا کی قسم ہم نے انہوں کے علم میں مت کی۔ یہ سن کر میں ہنسا۔ وہ میرے بیٹے چہرے میں اور زور سے ہنسا۔ وہ اور حیران ہوتے چلے گئے۔ پھر یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی کہ شہر انیسویں میں ایک شخص دارالامان ہے جہاں رہتا ہے۔

"آج کے دن بھی۔"

"ہاں آج کے دن بھی۔"

لوگ حیران ہوئے اور خوف زدہ ہوئے یہ حیران اور خوف زدہ لوگ میرے ارد گرد اکٹھے ہونے لگے۔ پہلے انہوں نے دور سے ایک خوف کے ساتھ جھپٹے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ صحت کر کے قریب آئے آج میں سرگوشیاں کیں کہ یہ شخص تو واقعی ہنس رہا ہے۔

"یہ نکل کون ہے؟ ... کہاں سے آیا ہے؟"

"اللہ بجز جانتا ہے۔"

"کیسے ان کا پاس تو نہیں ہے؟"

"ہو سکتا ہے۔" ایک نے دوسرے کو آگھوں آنکھوں میں دیکھا۔ جب میں نے کہا "اے لوگوں! میں ان میں سے نہیں ہوں۔"

"پھر تو کون میں سے ہے؟"

میں کھن میں سے ہوں میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس آن ایک بوڑھا مجمع سے نکل کر آیا اور گویا ہوا "اگر تو ان میں سے نہیں تو زوری کر۔"

"کس کے حال پر؟" میں نے پوچھا۔

"میری سارا نکل کے حال پر۔"

"کس لئے؟"

"اس لئے کہ جو چکا تھا وہ پھر ہوا اور جو چکا ہے وہ پھر ہوگا۔"

یہ سن کر میں حیران رہی۔ میں نے انہیں کیا اور کہا اسے بزرگ کیا تو نے دیکھا کہ جو لوگ اپنی زمین سے بچھڑ جاتے ہیں پھر کوئی زمین انہیں قبول نہیں کرتی۔"

"میں نے یہ دیکھا اور یہ جانتا کہ ہر زمین ظالم ہے۔"

"تو زمین جنم دیتی ہے وہ بھی؟"

"ہاں جڑ میں جنم دیتی ہے وہ بھی اور جڑ میں دارالامان بنتی ہے وہ بھی۔ میں نے کیا جام کے گھر میں جنم لیا اور کیا کے اس بکشتہ نے یہ جانتا کہ دنیا میں دکھ ہے اور روز ان کی صورت نہیں ہے اور ہر زمین ظالم ہے۔"

"اور آج ان؟"

"آج ان سے ہر چیز باطل ہے۔"

میں نے جا لے کہا اور کہا "سوچنے کی بات ہے۔"

"سوچنے کی بات ہے۔"

"بزرگ سوچی تو انسانیت کی اصل تاریخ ہے۔"

دودھ کوک پولا "انسانیت بھی باطل ہے۔"

"پھر جن کیا ہے؟" میں نے زحیٰ ہو کر پوچھا۔

"حق؟ وہ کیا جڑ ہوتی ہے؟"

"حق۔" میں نے ہر سہ زور اور محنت سے کہا۔

اور اس نے سادگی سے کہا کہ "تھے حق کہتے ہیں وہ بھی باطل ہے۔"

میں نے یہ سنا اور سوچا کہ یہ یوز حاضرس موت کے اثر میں ہے اور یہ یسوعی کا کے دستے میں ہے۔ تو ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑا اور یہاں سے نکل چل کر تجھے زندہ رہنا ہے۔ سو میں نے اس قبیلہ کی طرف سے منہ پھیرا اور اپنی جان بچا کر بھاگا مگر میں ایک عجیب میدان میں جا لگا جہاں غفلت اسٹڈی ہوئی تھی اور رخ کا فکارہ بچا تھا۔ میں نے پوچھا کہ گو کہ یہ کون سی گھڑی ہے اور یہ کیا مقام ہے۔ ایک شخص نے قریب آ کر کان میں کہا کہ یہ زوال کی گھڑی ہے اور یہ مقام عبرت کا ہے۔

"اور یہ کون شخص ہے جس کے منہ پر قہر کیا گیا ہے۔"

اس شخص نے گھڑے زور بھری نظروں سے دیکھا اور کہا "تو اسے نہیں پہچانتا؟"

"نہیں۔"

"اے بھٹل آدی پتو ہے۔"

"میں؟" میں سائلے میں آ گیا۔

"ہاں تو۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا اور میری پلٹیں پلٹتی چلی گئیں۔ دوتو جی ٹی تھا۔ میں نے اپنے آپ کو پہچاننا اور میں مر گیا۔

تیسرا آدی کہنے لگا "اپنے آپ کو پہچاننے کے بعد زندہ رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔"

پہلے آدی نے اسے غور سے دیکھا اور پوچھا کہ "اچھا تو وہ تو تھا جس کے منہ پر قہر کیا گیا تھا۔"

"ہاں وہ میں تھا۔"

"میں بھگدہ تھا وہ میں تھا۔" پہلا آدی بولا۔

"تو؟"

"ہاں میرا مکان سبکی تھا۔ بہر حال پتہ چل گیا کہ وہ مجلس میرا مکان تھا جس کے منہ پر قہر کیا گیا تھا وہ میں نہیں تو تھا۔" یہ کہہ کر پہلا آدی مطمئن ہو گیا۔ مگر پھر رفتہ رفتہ اسے شکلی ہوئے گی۔ ایک الایت کے ساتھ دودھ اسے یاد آیا جب اس کے منہ پر قہر کیا گیا تھا۔ اور اب جب وہ بولا تو اس کی آواز اتنی سپاٹ نہیں رہی جتنی پہلے تھی۔ اس نے دوسرے آدی کو طلب کیا۔ "میں نے لٹا لٹا اور تونے مجھے لٹا لٹا بھیا۔ وہ میں ہی تھا جس کے منہ پر قہر کیا گیا تھا۔"

دوسرے آدی نے اپنی اسی لہجہ میں عادی آواز میں کہا "میں نے اس لٹل کو جس پر قہر کیا گیا تھا بہت غور سے دیکھا تھا وہ بالکل میری شکل تھی۔"

پہلے آدی نے دوسرے آدی کو سر سے ہی تک غور سے دیکھا۔ پکا پکا ایک لہر اس کے دماغ میں اٹھی اور اس نے رکتے رکتے کہا "کیس تو میں تو نہیں ہے؟"

"میں تو؟..." نہیں ہرگز نہیں۔ میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے میں اس قسم کے کسی مطالعہ کا فائدہ نہیں ہو سکتا۔"

"تو نے اپنے آپ کو کیا پہچاننا؟" پہلے آدی نے سوال کیا۔

دوسرے آدی نے جواب دیا۔ "میں وہاں جس کے منہ پر قہر کیا گیا ہے۔"

"یہ پہچان تو میری بھی ہے۔" پہلا آدی بولا۔ "اور اس سے مجھے شک پڑا کہ شاید تو میں ہو۔"

مگر کیا ضرور ہے۔ "دوسرے آدی نے کہا کہ "برو پھر جس پر قہر کیا ہے تیرا ہی چہرہ ہو۔"

فیک ہے مگر یہ تو ہو سکتا ہے کہ تیرا چہرہ تیرا نہ ہو میرا ہو۔"

اس پر دوسرا آدی دوسے میں بڑکھا۔ اس نے شک بھری نظروں سے پہلے آدی کو دیکھا۔ دونوں نے دیر تک ایک دوسرے کو شک بھری نظروں سے دیکھا اور طرح طرح کے دوسے کئے۔ آخر کو دوسرا آدی ہار کر بولا کہ "مہم مر چکے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو کیونکہ پہچان سکتے ہیں۔"

پہلا آدی بولا "کیا جب ہم سر نہیں تھے جب ایک دوسرے کو پہچانتے تھے؟"

اس پر دوسرا آدی لا جواب ہو گیا۔ مگر اسی وقت تیسرے آدی کو ایک لا جواب جواب تجوڑ سوجھی۔ اس نے پوچھا کہ تم میں سے اپنی لاش کون لے کر آیا ہے۔ پہلا آدی بولا کہ میں نے لے کر آیا ہوں۔ اس نے کہا "پھر ہوا میں کیوں تیر چلا تے ہو۔ لاش کو دیکھ لو۔ ابھی

دور کا دور دورہ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔“

یہ تجویز دونوں فریقوں نے قبول کر لی اور پھر تینوں لاش کے پاس گئے۔ تیسرا آدمی لاش کو دیکھ کر خوف زدہ ہوا۔ پھر دوسرا "اس کا چہرہ خوش ہو گیا جب کہ کائنات ہو سکتی ہے۔"

دوسرا آدمی بولا "چرا منہ نہ دیکھا ہے تو پھر تو یہ طے ہے کہ یہ میری لاش ہے اس لئے کہ جب میرے منہ پر تھوکا گیا تو میرا چہرہ مسکایا تھا۔"

”چہرہ تو میرا بھی مسخ ہو گیا تھا۔“ پہلا آدمی بولا۔

”خیر اجروہ ک مستح ہوا تھا؟“

”خیر اچھو تو اسی گھڑی مسخ ہو گیا تھا جس گھڑی میں نے بے ہاںوں کال بند یا دوائی سائنو ٹی فزی کو اس کے بھائی کے ہاتھوں پر دیا تھا۔“

”ہاں میں اپنے سچے کے ساتھ لوگوں کے درمیان چلتا ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ میرے باپ نے مجھے دیکھا اور آگے بڑھ کر ملی اور مجھ پر ہاتھ رکھا۔“

پہلے آدمی نے اپنے باپ کا ذکر کیا تو دوسرے آدمی کو بھی اچانک یاد آگیا۔ "میرا باپ بھی کچھ سی سادگی سے مرعقاہ میں نے اس کے پاس جا کر اس کی شفقت چوری کو اس کے لئے کوشش کی اور رقت کے ساتھ کھا کر اسے میرے باپ حیدر ایسا آفرین کر گیا۔ باپ میری سزا صورت کو کھینچے گا۔ مگر بولا کہ اچھا ہوا کہ تیرے پاس آنے سے پہلے مر گیا۔ یہ سب کہہ کر نے اور دیکھنے کے بعد بھی تو زندہ آجاتا تو میں تجھے قیمت تک زندہ کی کا جو بھڑا ہٹانے کی بد دعا دیتا.... یہ میرے باپ کا آخری خضر تھا۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے چپ ہو گیا۔"

پہلا آدمی اپنی خشک آواز میں بولا "ہمارے بوڑھے باپ اپنے جوان بیٹوں سے زیادہ غیرت مند تھے۔ اور ہم نے ان کے ساتھ کر کیا کیا۔ میں اپنے مسخ پر سے والی لاش لے کر یہاں آ گیا اور اسے باپ کی لاش والوں جھڑایا۔"

دوسرا آدمی یہ سن کر چونکا اور بولا۔ ”مجھے تو یہ خیال ہی نہیں آتا تھا میں اسے اپنے آپ کی لاش میں جھونکا ہوا۔“

تیسرا آدمی ایک عجمی سے منسا کہنے لگا "آ" کے جب ہم ٹھکے تھے تو اسے آمادہ ہوئی کہ قبر میں مجھڑ آئے تھے۔ اب کے ٹھکے ہو تو

بہن! لاشیں چھوڑ آئے ہیں۔" یہ کہتے کہتے اس کی فحشی مہم ہو گئی اور ایک انصر کی نے اسے آیا۔ اسے اپنا پہلا لفظ یاد آ گیا۔ "خاص سے دھند میں اس سے بہت ہی صورت نظر آ گئی۔ روشن چروں کی ایک لمبی فحشی کہ اس کے قصور میں اضافہ آئی تھی۔ چہرے سے جڑا پے اوچھل ہونے کا پھر دکھائی نہیں دیتے۔ اور اب یہ دوسرا لفظ اور اب بھی۔۔۔ اس نے کسی کدو پر قبیلے کے ساتھ دل ہی دل میں کہا کہ یہ تو مجھے پتہ نہیں کہ میں کھل آیا ہوں یا نہیں کھل آیا۔ مگر بہت روشن چہرے پھر انھوں سے اوچھل ہو گئے ہیں۔ کتنے روشن چہرے خوب نظروں سے اوچھل ہوئے کتنے روشن چہرے اب نظروں سے اوچھل ہو گئے اور اسے یہ تصور کہ کدو کے قلوب ہو کر روشن چہرہ ہو جاوایا اس نے اس بار دیکھی فحشی وی ایسی پھر اس بار دیکھی۔ اس نے انصر دو بار دیکھی پہلے آوی اور دوسرے آوی کو کھٹکایا۔ "میں یہ غلط کہتا تھا تو اس بار ایک ہی واقعہ گرا۔ یہ کہ اسے اس کے چہرے میں کدو کے ساتھ یہاں آ گئے اور روشن چروں کو جیسے چھوڑ آئے۔"

دوسرا آدمی غلام میں ٹکٹا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ ملنے لگا تھا کہ دونوں نے جو جیسا کہاں جا رہا ہے تو؟

یوں کہ وہاں سے مجھے کم از کم اپنے باب کی لاش لے آنی چاہئے۔“

”اب وہاں سے کوئی دانش نہیں آ سکتی۔“

140

۱۱۰ - سید مرتضیٰ - ۱۱۱

”ایچھا؟“ تو کو پاس سے باب کی لاش دھجی پڑی رہے گی۔“

پہلے آدمی نے کہا "اے چاکر! لاش لاکر یہاں تو کیا کرتا۔ مجھے کچھ کہیں اپنی لاش لے آئے ہوں۔ اور اسے اپنے کاندھے پر لے کر چل رہا ہوں۔"

”اے دن کیوں نہیں کرتا؟“ تمہارا آدمی بولا۔

"El Libro de Amal"

۱۷- "میں نے اپنے والدین کو جو کچھ چاہا اسے دیا۔" (پروفیسر، ۱۹۹۸)

”فہم فرماتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب سچ ہے۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب سچ ہے۔“

1000 (1) (2) (3) (4) (5) (6) (7) (8) (9) (10) (11) (12) (13) (14) (15) (16) (17) (18) (19) (20) (21) (22) (23) (24) (25) (26) (27) (28) (29) (30) (31) (32) (33) (34) (35) (36) (37) (38) (39) (40) (41) (42) (43) (44) (45) (46) (47) (48) (49) (50) (51) (52) (53) (54) (55) (56) (57) (58) (59) (60) (61) (62) (63) (64) (65) (66) (67) (68) (69) (70) (71) (72) (73) (74) (75) (76) (77) (78) (79) (80) (81) (82) (83) (84) (85) (86) (87) (88) (89) (90) (91) (92) (93) (94) (95) (96) (97) (98) (99) (100) (101) (102) (103) (104) (105) (106) (107) (108) (109) (110) (111) (112) (113) (114) (115) (116) (117) (118) (119) (120) (121) (122) (123) (124) (125) (126) (127) (128) (129) (130) (131) (132) (133) (134) (135) (136) (137) (138) (139) (140) (141) (142) (143) (144) (145) (146) (147) (148) (149) (150) (151) (152) (153) (154) (155) (156) (157) (158) (159) (160) (161) (162) (163) (164) (165) (166) (167) (168) (169) (170) (171) (172) (173) (174) (175) (176) (177) (178) (179) (180) (181) (182) (183) (184) (185) (186) (187) (188) (189) (190) (191) (192) (193) (194) (195) (196) (197) (198) (199) (200) (201) (202) (203) (204) (205) (206) (207) (208) (209) (210) (211) (212) (213) (214) (215) (216) (217) (218) (219) (220) (221) (222) (223) (224) (225) (226) (227) (228) (229) (230) (231) (232) (233) (234) (235) (236) (237) (238) (239) (240) (241) (242) (243) (244) (245) (246) (247) (248) (249) (250) (251) (252) (253) (254) (255) (256) (257) (258) (259) (260) (261) (262) (263) (264) (265) (266) (267) (268) (269) (270) (271) (272) (273) (274) (275) (276) (277) (278) (279) (280) (281) (282) (283) (284) (285) (286) (287) (288) (289) (290) (291) (292) (293) (294) (295) (296) (297) (298) (299) (300) (301) (302) (303) (304) (305) (306) (307) (308) (309) (310) (311) (312) (313) (314) (315) (316) (317) (318) (319) (320) (321) (322) (323) (324) (325) (326) (327) (328) (329) (330) (331) (332) (333) (334) (335) (336) (337) (338) (339) (340) (341) (342) (343) (344) (345) (346) (347) (348) (349) (350) (351) (352) (353) (354) (355) (356) (357) (358) (359) (360) (361) (362) (363) (364) (365) (366) (367) (368) (369) (370) (371) (372) (373) (374) (375) (376) (377) (378) (379) (380) (381) (382) (383) (384) (385) (386) (387) (388) (389) (390) (391) (392) (393) (394) (395) (396) (397) (398) (399) (400) (401) (402) (403) (404) (405) (406) (407) (408) (409) (410) (411) (412) (413) (414) (415) (416) (417) (418) (419) (420) (421) (422) (423) (424) (425) (426) (427) (428) (429) (430) (431) (432) (433) (434) (435) (436) (437) (438) (439) (440) (441) (442) (443) (444) (445) (446) (447) (448) (449) (450) (451) (452) (453) (454) (455) (456) (457) (458) (459) (460) (461) (462) (463) (464) (465) (466) (467) (468) (469) (470) (471) (472) (473) (474) (475) (476) (477) (478) (479) (480) (481) (482) (483) (484) (485) (486) (487) (488) (489) (490) (491) (492) (493) (494) (495) (496) (497) (498) (499) (500) (501) (502) (503) (504) (505) (506) (507) (508) (509) (510) (511) (512) (513) (514) (515) (516) (517) (518) (519) (520) (521) (522) (523) (524) (525) (526) (527) (528) (529) (530) (531) (532) (533) (534) (535) (536) (537) (538) (539) (540) (541) (542) (543) (544) (545) (546) (547) (548) (549) (550) (551) (552) (553) (554) (555) (556) (557) (558) (559) (560) (561) (562) (563) (564) (565) (566) (567) (568) (569) (570) (571) (572) (573) (574) (575) (576) (577) (578) (579) (580) (581) (582) (583) (584) (585) (586) (587) (588) (589) (590) (591) (592) (593) (594) (595) (596) (597) (598) (599) (600) (601) (602) (603) (604) (605) (606) (607) (608) (609) (610) (611) (612) (613) (614) (615) (616) (617) (618) (619) (620) (621) (622) (623) (624) (625) (626) (627) (628) (629) (630) (631) (632) (633) (634) (635) (636) (637) (638) (639) (640) (641) (642) (643) (644) (645) (646) (647) (648) (649) (650) (651) (652) (653) (654) (655) (656) (657) (658) (659) (660) (661) (662) (663) (664) (665) (666) (667) (668) (669) (670) (671) (672) (673) (674) (675) (676) (677) (678) (679) (680) (681) (682) (683) (684) (685) (686) (687) (688) (689) (690) (691) (692) (693) (694) (695) (696) (697) (698) (699) (700) (701) (702) (703) (704) (705) (706) (707) (708) (709) (710) (711) (712) (713) (714) (715) (716) (717) (718) (719) (720) (721) (722) (723) (724) (725) (726) (727) (728) (729) (730) (731) (732) (733) (734) (735) (736) (737) (738) (739) (740) (741) (742) (743) (744) (745) (746) (747) (748) (749) (750) (751) (752) (753) (754) (755) (756) (757) (758) (759) (760) (761) (762) (763) (764) (765) (766) (767) (768) (769) (770) (771) (772) (773) (774) (775) (776) (777) (778) (779) (780) (781) (782) (783) (784) (785) (786) (787) (788) (789) (790) (791) (792) (793) (794) (795) (796) (797) (798) (799) (800) (801) (802) (803) (804) (805) (806) (807) (808) (809) (810) (811) (812) (813) (814) (815) (816) (817) (818) (819) (820) (821) (822) (823) (824) (825) (826) (827) (828) (829) (830) (831) (832) (833) (834) (835) (836) (837) (838) (839) (84

¹⁰ Ibid., p. 67.

”تو مر نہیں؟“ دونوں نے اسے غور سے دیکھا۔

”نہیں۔ میں ابھی زندہ ہوں۔“

دونوں اسے کھینچ گئے۔ ”تو اپنے تئیں زندہ جانتا ہے؟“

”ہاں میں زندہ ہوں مگر۔۔۔۔۔“

”مگر؟“ دونوں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”مگر لاچہ ہوں۔“

”لاچہ؟“

”ہاں لاچہ معلوم ہے کہ اس قیامت میں بہت سے لوگ لاچہ ہو گئے ہیں۔“ ”اور کیا تجھے یہ پتہ ہے کہ پہلا آدمی ہوا؟“ میرا لہجہ

ہوئے ہیں ان میں سے بہت سے نقل ہو چکے ہیں۔“

”مجھے یہ پتہ ہے مگر میں متونوں میں نہیں ہوں۔“

”بہت سے اس طور پر مجھے سمجھ رہے ہیں۔“

”میں تمہاری طرح مرنے والے میں نہیں ہوں۔“

”تجھے جب کتو لاچہ ہے یہ کیسے معلوم ہوا؟“

”بات یہ ہے کہ شہر خرابی میں زندوں کا پتہ نہیں چل رہا مگر مرنے والوں کی لاشیں روز بروز بڑھ رہی ہیں۔ بس اگر میں مرا ہوتا تو

کسی رنگ سے بھی مرا ہوتا میری لاش اب تک برآء ہو چکی ہوتی۔“

”اکرتو مر نہیں ہے تو تجھے ایسروں میں ہونا چاہئے اور اکرتو ایسروں میں ہے تو مجھ لے کر پکڑ پکڑا ہوا گیا۔“

تیسرا آدمی پکارا ”پکڑ پکڑا ہوا گویا اس کا کیا مطلب؟“

”مطلب یہ ہے“ دوسرا آدمی ہوا ”کتو پکڑ پکڑا ہوا کہ اس شہر میں کتنی مٹی کا پتہ ہے جس شہر سے کبھی نکلا تھا۔ ایک ریلوے کے ساتھ یہ واقعہ

گزر چکا ہے۔ دوا سیر ہو کر وہی کتنی کیا جہاں پیدا ہوا تھا۔ جب وہ وہاں سے بھاگ نکلنے کا جن کر رہا تھا تو سانچی نے کہا ریلوے جہاں

سے کیوں بھاگتا ہے۔ یہی جگہ ہے کیا کہتی ہے وہ روڈ اور یو لاک کہ جب میں روزانہ زندوں سے بھاگتا ہوں تو سانچے سرسوں کا کھیت

لہلہاتا دکھائی دیتا ہے۔ سرسوں اب پھلنے لگی ہے کہ بہت قریب سے ختم بھی اور اسیری نے اگلے ہو کر قیامت اٹھائی بہت بھی آ

گئی تو پکڑ پکڑا ہوا۔ بہت جہم بھی اور اسیری۔۔۔۔۔ نہیں۔ ان تین کو اکٹھا نہیں ہونا چاہئے۔ اس میں بہت فرق ہے اور وہ زندوں

سے ایک رات کچل کچل بھاگا اور لاچہ ہو گیا۔“

”لاچہ ہو گیا۔“ تیسرا آدمی پوچھا ”کیوں وہ میں تو نہیں تھا۔۔۔۔۔ شاید۔۔۔۔۔ کہ سرسوں میرے شہر میں بھی ایسی پہلانی تھی کہ قیامت

اٹھائی تھی۔“

”نہیں وہ تو نہیں تھا۔“

”بہت جہم بھی اور اسیری“ تیسرا آدمی بڑبڑایا اور سوچ میں پڑ گیا پکڑ پکڑا۔ ”نہیں وہ میں نہیں ہو سکتا۔ میں اسیروں میں شامل

نہیں تھا۔“

پہلا آدمی کہنے لگا۔ ”اسیری کے یہاں جہم بھی وہاں پہنچنا کتنی عجیب سی بات ہے۔“ دوسرا آدمی ہوا ”گیا والا آدمی اسیروں

میں شامل ہوتا تو آج وہ کیا کی دھرتی پہ ہوتا۔“ ”تیسرے آدمی نے جہم بھری لی“ ہاں واقعی کتنی عجیب بات ہے۔ میری دادی غدر کے

تھے تباہ کرتی تھی۔ تباہ کرتی تھی کہ کتنے لوگ ان دنوں رہائش ہوئے تھے۔ اپنے شہروں سے ایسے گئے کہ پکڑ پکڑا ہوا۔

اور اک صورت تھی جو فرنگی سے بہت بڑی۔ پکڑ پکڑا ہوا کہ اپنے خوشبو شہر سے نقلی اور نیپال کے جنگلوں میں لکھ گئی۔ جنگل جنگل میں ہوئے

آوارہ کہ بھری اور کھو گئی۔“ یہ کہتے کہتے اس نے غصہ اسانس بھرا پکڑ پکڑا ”آفت زدہ شہر میں لاچہ ہونے سے یہ پتہ ہے کہ آدمی کتنے

مہیب جنگلوں میں کھو جائے۔“ وہ چپ ہوا اور غیالوں میں کھو گیا۔ اسے اپنا پہلا لکھنا پکڑ پکڑا ”دیر تک غیالوں میں کھو یا رہا پھر

ایک کچھ تو دے کے ساتھ کہنے لگا کاش میں نے نیپال کے جنگلوں میں ہجرت کی ہوتی۔“

پہلا دوسرا تیسرا اب تینوں آدمی چپ تھے۔ چپ اور بے حس حرکت۔ جیسے بولے اور حرکت کرنے کی خواہش سے مکمل نجات

حاصل کر چکے ہوں۔ سامنے میں گزرتی چلی گئیں۔ اور وہ اس طرح گم سم بیٹھے تھے۔ آخر کو رفتہ رفتہ تیسرے آدمی نے فحشی محسوس کی۔

اس نے پیلے آدمی کو دیکھا دوسرے آدمی کو دیکھا وہ دونوں چاند بیٹھے اور اپنی بے حرکت نظروں کے ساتھ غلامیں کئے جا رہے تھے۔

اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں دو بھی چاند تو نہیں ہو گیا ہے۔ یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ وہ چاند نہیں ہوا اس نے کوشش کر کے جتنوں کی۔ لمبی

سی بھائی کی اور دل ہی دل میں اطمینان کے ساتھ کہا کہ میں ہوں۔ پھر اس نے پیلے اور دوسرے کو کھٹک کر کہا ”کیا میں سے اب

چلیں۔“ ”وہاں ہونے کا اعلان کرنا چاہتا تھا۔“

دونوں نے کسی قدر تامل کے بعد اپنی بے نور لکھائی غلام سے بنا کر اس پر مرکوز کیں اور بھی آواز میں کہا ”کہاں چلیں۔ اب کہاں

آج نہیں توکل نہیں تو پر سوں بچانا جائے گا اور بچا جائے گا۔

”جی تو مجھے حرج کالگا ہوا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ جا کر دیکھوں کہ میں ہوں کہاں۔“

”جی یہ پتہ چل بھی گیا کہ تو کہاں ہے تو فریق کیا پڑے گا۔“ دوسرا آدی بولا۔

”وہاں سے لٹنے کی کوئی سہیل پیدا کروں گا۔“

”لٹنے کی سہیل؟“ دوسرے آدی نے اسے غور سے دیکھا۔ ”اے لاپچہ آدی کیا تجھے پتہ نہیں ہے کہ سب رستے بند ہیں۔“

”یہ تو فیک ہے۔ مگر آ کر بیک لاپچہ رہوں گا مجھے اپنا اپنا پتہ لینا چاہئے اور کیا خبر ہے کہ لٹنے کی کوئی سہیل پیدا ہوئی جائے۔“

”اے سادہ دل آدی تو کل کے کہاں جائے گا؟“ دوسرا آدی بولا۔

”کہاں جاتا۔ نہیں آ جاؤں گا۔ آخر پہلے بھی تو آنے والے نہیں آئے تھے۔“

پہلے آدی نے اسے گھور کر دیکھا ”یہاں؟.... یہاں اب تو کہاں آئے گا۔ میں نے تجھے بتایا نہیں کہ میری لاش ہے گور پڑی ہے۔“

تیسرا آدی شش و پنج میں پڑ گیا پھر کہاں جاؤں گا۔

دوسرا آدی دونوں کو یکے کر گریاؤں ہوا ”اے بے فکروں کیا میں نے تمہیں کہا کہ آدی کی بات نہیں بتائی تھی۔ ہر زمین کاظم ہے اور آسمان سے ہر جہز باطل ہے اور اکلے ہوؤں کے لئے کہیں اماں نہیں ہے۔“

”پھر؟“ تیسرے آدی نے مایوسانہ پوچھا۔

دوسرا آدی دیکر اسے گنگلی ہاتھ دے دیکتا رہا۔ حتیٰ کہ تیسرے کو لگا کہ وہ جامہ ہوتا جا رہا ہے۔ پھر بولا۔ ”پھر یہ کہ اے لاپچہ

آدی قلعہ جا اور مت پوچھ کہ تو کہاں ہے اور جان لے کہ تو مریا ہے۔“



جائے، مگر تو مریے گئے۔“

تیسرے آدی نے خوف کے ساتھ ان دونوں کے منہ چروں اور بے حرکت بے نور آنکھوں کو دیکھا۔ مجھے یہاں سے اٹھ چلنا

چاہئے۔ مہرا میں بھی جامہ ہو جاؤں۔ دوسرا پڑا پھر بہت کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں نے اسے اٹھتے ہوئے دیکھا اور کس طرح کے

لبہ اور منہ سے خالی آواز میں پوچھا ”تو کہاں جا رہا ہے۔“

دو بولا ”مجھے چل کر دیکھنا چاہئے کہ میں کہاں ہوں۔“ وہ لگا پھر سوچ کر بولا۔ ”نہیں واقعی میں امیروں میں تو نہیں ہوں اور وہیں

پہنچ گیا ہوں۔“

”کہاں؟“ پہلے آدی نے پوچھا۔

اس نے پہلے آدی کی بات جیسے سن لی نہیں۔ بس دوسرے آدی کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور پوچھا ”کیا تجھے یقین ہے کہ وہ

زعماء سے نکل بھاگا تھا۔“

”ہاں اس نے اپنی سرسوں کو دیکھا اور اپنے شہر کے زعماء سے نکل بھاگا۔“

”اور کیا تجھے یقین ہے کہ وہ میں نہیں تھا؟“

”نہیں۔“ دوسرے آدی نے کہا اور یہ کہتے کہتے تیسرے آدی کو غور سے دیکھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ دوسرے آدی نے تیسرے

آدی کا متہ غور سے دیکھا۔ چونکہ بولا۔ ”کیا تو شہر افسوس میں نہیں تھا؟“

”تو نے فیک بچانا۔ میں شہر افسوس ہی میں تھا۔“

”میں نے تجھے مشکل سے بچانا کہ تیرا چہرہ بکڑ چکا ہے مگر جب تو شہر افسوس میں تھا اور موت کا اٹھارہ کرنے والوں کا منتظرین تھا

تب تو تیرا چہرہ اور دستا تھا۔ تیرا چہرہ بکڑ اور کیسے بکڑا۔“ تیسرا آدی یہ سن کر گھج ہوا لٹکایا تے ہوئے بولا ”نہیں یہ گھج کہ جب میں نے

ان لوگوں سے منہ موڑا ہی ہے میرا چہرہ بکڑتا چلا گیا۔“

”تجھ ہے کہ تو وہاں سے نکل آیا۔ شہر افسوس کے تو سارے رستے مسدود تھے تو پکڑا نہیں گیا؟“ بکڑا کیسے جاتا۔ بچانا جاتا

تب بکڑا جاتا۔ مگر میرا تو چہرہ ہی بکڑ کے بدل گیا تھا۔“

”اس کا مطلب یہ ہے۔“ پہلا آدی بولا ”تیرا شہر وہ نہات دہندہ ہے۔“

دوسرا آدی بولا ”ابھی سے اتنا غوش ہم نہیں ہوتا چاہئے۔ ابھی تو یہی پتہ نہیں ہے کہ یہ آدی ہے کہاں۔ اگر وہیں نہیں چھپا ہوا ہے تو

کہانی کی کہانی

مجھے فرما بھی طور پر اپنی کسی کہانی کی کہانی سنانی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ میں نے کوئی کہانی لکھی بھی ہے۔ کہانی تو رات کا انعام ہے۔ کہانی تو جس سے رات کی نیند اڑنے اور دن کو سفر رستہ بولے۔ رات گئی رات کے لوگ گئے اس کے ساتھ رات کا انعام کیا رو گئے مجھ ایسے افسانہ نگار کہ مختصر افسانے لکھتے ہیں جن سے ندرات کی نیندیں اڑتی ہیں، دن کو سفر رستہ بولتے ہیں، لکھنے والوں اور سننے والوں کا بھلا بے شک ہو جاتا ہے۔ مختصر افسانے میں نے بہت لکھے چند ایک پہ اداب بھی پائی مگر رات کے انعام سے عرم ہی رہا۔ بہت سوچنے پر مجھے اپنا ایک افسانہ یاد رہا ہے جس پر یوں داد تو دینی مگر تاہم کچھ لکھنے کی ایک بات بھی تھی ”تہا راکا ہوا داد افسانہ نہیں ہے“ کتنا ہے دو؟“ مگر یہ داد تو اتنی بڑی ہو گئی کہ مجھ سے بھسم نہیں ہوئی۔ کتنا اور کہانی کے لفظ سے بہر صورت ملتے ہیں۔ کتنا بھی تو رات ہی کا انعام ہے اور سامع کا معاملہ شام پڑے شروع ہوتی ہے اور رات گئے تک جاری رات ہی ہے اس میں مکالمہ بھی ہوتا ہے اور خود کا بھی اور دوسرے کی شاعری بھی ہوتی ہے شعر بھی، عقیدت بھی یا کچھ نہ کیلئے بھی شامل ہوتی ہے اور وہ بے بالا کارنگ بھی پھر باطنی حال اور مستقبل کو مل کر ہوا وہاں وقت کی کہانی بننے لگتا ہے۔

بار بار میں سوچتا ہوں کہ اس افسانے پر کتنا کاف کیسے گزرا۔ مختصر افسانہ چار آدمی ہیں، بندہ میاں مرزا صاحب، شہناز علی، منصور حسین، دونوں وقت ملتے ہیں۔ سامنے تھوڑا کھارے اور سڑک کے قصبے سامنے ہمارے ہیں۔ منصور حسین کو اپنی ایک بھولی کہانی یاد آتی ہے۔ ہر بار سامنے کی نیت یا نعت ہے اور ہر بار کوئی دوسرا اٹھتا ہے۔ پچھلے رات ہے۔ بہت دیر کے بعد موقع ملتا ہے۔ تو سگی سے ایک صیت گزرتی ہے اور ساری بات اس کے ذہن سے اتر جاتی ہے۔ اس کا کسٹن دینا اسے ہلالتے آ جاتا ہے۔ وہ جاتے جاتے گھر کے دروازے پر پہنچ کر کھڑ پڑتا ہے کہ کہانی ضرور سنانی ہے۔ گھر اب پار لوگ نماز کے لئے جا چکے ہیں۔ موٹے سے غلی پڑے ہیں۔ پھر واپس ہو لیتے ہے اور کہانی ان کی رات ہی ہے۔

یہ تو خیر ضرور ہے کہ اس افسانے میں بات کہانی سامنے ہی سے چلتی ہے اور کہانی بھی سڑکی۔ پرانی کہانیاں اور داستانوں میں کیا ہمارے یہاں اور کیا دوسروں کے یہاں سارا قصہ سڑی سے چلتا ہے۔ پرانے زمانے میں سڑا سڑا زندگی کا بہت اہم سحر کتا۔

مطر کی بات اور تجربوں کی گئی۔ سڑ سڑیہ نظر بھی رہا ہے اور بر پادی کا بہانہ بھی اور وسائل سڑکی تبدیلی کے ساتھ قوموں کی حالت اور تبدیلی کی صورت بدلی ہے۔ شہناز علی اور مرزا صاحب اگلے وقتوں کے لوگ ہیں انہیں نئے زمانے سے شکایت ہی ہے یہ کہ وسائل سڑ بدل گئے جس سے سڑکی وقت بھی کم ہوئی اور انسانی تجربے کی رنگارنگی اور زرخیزی بھی زائل ہوئی۔ ان کے اس اہواز نظر کے رات سے نسل انسانی عہد قدیم کی بات آتی ہے۔ اس عہد کی بات جب آدمی فطرت کی دشمن طاقتوں کے ترسے میں تھا اور گو پوری طرح اچھٹا ہر شخص تھا مگر جگہ واری سے گزر رہا تھا۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔ ان دنوں نہ تہا راکا ہوا داد کی رشتی۔ اوپر تار سے جیسے وہ دیر ہو جاتی مٹا لیں۔ کوئی مثال اچانک سے بچھ جاتی اور دل دھک سے رو جاتا کبھی کبھی تار ٹوٹا اور آسمان پر لمبی کبیر کھینچی چلی جاتی دل دھک کے لگنا کبھی خیر مسافرت میں آ رہا تھا مگر دیکھو۔ رات اب گھنٹوں میں گزرتی ہے۔ آگے عمریں گزر جاتی ہیں اور رات نہیں گزرتی تھی۔ رات ان دنوں پوری صدی ہوئی تھی۔“

یہ قدیم زمانہ مرزا صاحب نے آٹھوں سے نہیں دیکھا ہے مگر کیا ضرور ہے کہ آٹھ سے دیکھنے کے بعد ہی بات اپنا تجربہ بنے۔ یہ قدیم باطنی تو ہمارے خون میں شامل ہے ہمارے نسل شعور کا حصہ ہے۔ زمانے نہیں ہیں باطنی حال مستقبل مگر اس افسانے میں چھو ہو گئے ہیں باطنی سے تین روپ بھرے ہیں۔ انسانی نسل کا باطنی ایک کردہ کا باطنی فرد کا باطنی۔ مرزا صاحب اس انسانی تجربے کی بات کر رہے ہیں جو پوری نسل کا درد ہے۔ شہناز علی نے اس درد کا قصہ پچھلے رات میں اس پر عظیم کے لوگوں کا انصاف مسلمانوں پر ایک کرنا کہ تجربہ بن کر رہا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب سڑک طریقہ ہمارے یہاں بدل رہا تھا ایک ہی اور باطنی تبدیلی کی سواری ہم پریش کر رہی تھی۔ ہم نے باطنی نسل کے اس بے گورہ کئے کے لئے مستعد تھا اور توہمات کا مورچہ بنایا۔ مورچہ ہوا تھا۔ رات کو کیا۔ شہناز علی کا بے والد کے حوالے سے وہ دن یاد آتے ہیں جب مکمل مکمل اس زمین کے سینے پہ لوہے کی پڑی تھی جس کی گاڑی دلی کے قریب پہنچی کرکٹ چوٹی میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ پرانے حجاز کے لوگوں کو پڑی اٹھو داکے دیکھنے پر اصرار ہے۔ پڑی اکھڑی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شفاف اجاں ہے گورہ کے گھر سے باطنی رکھا ہے اس پر چاندی کا گورہ ایک چٹائی پر ایک سفید ریش بڑ رگ پیچھے ہوئے وہ سفید ریش بڑ رگ دیکھتے دیکھتے آٹھوں سے اوچھل ہو گئے۔ چٹائی غالی کور سے گھر کے کا پانی غائب ریل گاڑی میں دے کر مکمل غلی۔ یہ سینی ایک دور کے فٹ مٹا دی تھی۔ اب سنے دور کی سواری آ رہی تھی۔ فرنگی کی غلامی کا دور، دشمن کی غلامی کا دور، سڑکی دور، رنگارنگی زرخیزی خواب ہو گئی۔ اب ہم ہیں اور ریل گاڑی کا شہر سڑا اور ماتم یک شہر آرزو۔ مرزا صاحب کچھ کہتے ہیں کہ سواریاں غم سفر مٹ ایک سڑکی بات ہے سو وہ ہے سواری کا ہے۔ اس افسانے میں ہے سواری کا سڑکی آیا ہے اور اس اہواز سے کہ منصور حسین کے ذہنی سفر کا رستہ کاٹا ہے اور یاد آتی ہوئی کہانی کو بھلا دیتا ہے۔ یہ کہانی ایک فرد کا باطنی ہے۔ مرزا صاحب کی ذہنی واردات ذہنی نہیں پوری

انسانی نسلی کی جانیاں اے۔ جماعت ملی کے تجزیہ تجربے میں ایک ہری قوم حصہ دار ہے لیکن منظور حسین کے سنے میں جو کرن اتاری ہے وہ بجا شرکت فحیر سے اس کی دولت ہے شاید اسی لئے وہ فحیر ضروری طور پر اس ہیر سے کو چھپا رہا ہے۔ یہ ہیر اسی ریل گاڑی کے فحیر سفر میں اسے ملے ہے۔ شجاعت ملی حراج کے اعتبار سے اس زمانے کے آدی ہیں جب ریل گاڑی ہمارے شعور پر عویش کر رہی تھی۔ منظور حسین آج کا آدی ہے جب کہ ریل گاڑی شعور میں گھر گئی ہے مرزا صاحب اور شجاعت ملی کی طرح دور ریل کا شاکہ نہیں سوچتا کہ گھڑے کا پانی سٹکھ گیا۔

اس فحیر سفری کو سفر سمجھنے اور اس اندھیرے میں انفرادی تجربے کی کوئی کرن پیدا کیجئے۔ گویا ماضی یہاں سر جیتی طاقت ہے جو حال میں نفوذ کر رہی ہے اور حال کیا ہے؟ وہ گھڑی جب دونوں وقت ملتے ہیں ماضی ماضی اور مستقبل کا جنکشن۔ شام گہری ہوئی ہے کہ سامنے سے میت گزرتی نظر آتی ہے۔ یہ مستقبل ہے موت ہمارا مستقبل ہے۔ سب کھاناں سے لمبی کھانا۔ سوار یاں ہل گئیں سفر کی خطرہ کی قلم ہوئی گریاں سفر اسی طرح اندھیرا اور گھلگھل ہے۔ لائین لے کر ٹھٹھے مشائیں چلائے ہیں بجلی روشن کیجئے یہ اندھیرا یہ اندھیرا اٹل ہے۔ ماضی بھی اندھیرا مستقبل بھی اندھیرا ہے۔ منظور نقد حال ہے جس نے اسے ملھی میں لے لیا اس کا سینہ روشن۔ جس کی چٹکی سے یہ نقد کھانا کسے لے دینا اندھیرا اور زندگی قلم۔ حال ریل گاڑی ہے اس کی رفتار الامان بحر میل دیتا ہے۔ وہی منظور حسین الامان احساس کو چلتے چلتے بھروسہ کی کیفیت جیسے اس کا پہاڑی ہے چمکڑا کر کیا کھڑا رہ گیا ہے اور گاڑی سٹی دیتی شور مچاتی دور ریل گئی ہے۔ لیکن یہ احساس کہ گاڑی آگے چلتے چلتے پیچھے کی طرف بٹنے لگی ہے۔ رات جانے کب شروع ہوئی تھی اور کب قلم ہوئی کالی

صدی آدی تڑکنی ہے اور آدی ہوتی ہے۔ اور ریل آگے چلتے چلتے بھاگے پھر کا رہی ہے۔ کھلی پہ گھوم رہی ہے۔ خاکسار کو بھید ہے بٹنے کا شوق ہوتا ہوا کی جڑ کا بھی ذکر کر سکتا تھا۔ مگر اپنی دانست میں ہمارے ہاں آج کے دور میں وقت کا کم کوئی سواری بن سکتی ہے وہ ریل گاڑی ہے یہ وہ سواری ہے جو وقت کی طاقت اور ایک نئی تہذیب کا براہ دست بن کر آئی اور صدیوں کی تہذیب کی راجدھانی پر دھوا دھوا۔ وقت سواری بدلانے روشنی بھی مدافعت کا اظہار بھی استغلا کی تقریب اول مشائیں جیسے۔ پھر لائین آئیں۔ اب بجلی کی روشنی ہے۔ مگر وقت کی ہوا سے کہیں ان چراغوں سے لڑا جاتا ہے۔ وقت کی اس اندھیری گہری میں کوئی روشنی اندھیرے اور اندھیری کا مقابلہ کرتی ہے تو وہ انفرادی بصیرت کی روشنی ہے۔ یوں دیکھتے تو منظور حسین کی کہانی لگا کی کہانی بنتی ہے۔ وہ جدید حاضرین کا قلم کا ہے اپنے حال کو ملھی میں لے لیا اور زمانے کی نئی بادی طاقتوں کو گفتنی تجربے میں پھکھلا کر ایک روشن کرن کو نغمہ دیا ہے۔ ماضی کے مریض خزانوں میں وہ کیا ہے۔ مریض خزانوں کی آوازیں بلند ہیں۔ ان کی داستانوں میں بانگ مریخی اور بانگ شاعر ہے۔ منظور حسین کی کہانی تنقید کے اعتبار سے بے رعبہ اور ادھوری ہے وہ یہ کہانی سامنے کے لئے ہے تب اب بھی ہے مگر نہ سنا سکتے کے باوجود اسے اطمینان بھی ہے۔ منظور حسین کے پاس اطمینان اور بے اطمینانی کی یہ بللی بللیت اور اس کی تہ میں بللی بللی ادا ہے۔ پھر اس کی وہ

جہانی شاید انہیں وجود سے مجھے اپنا یہ کردار بہت اچھا اور مکمل مانتا لگتا ہے۔ پورا افسانہ اسی کردار کے گرد گھومتا ہے جو مکمل میں شامل بھی ہے اور مکمل سے الگ بھی ہے۔ فن کار کا بھی حال تو ہوتا ہے کہ زمان کے قلب میں کھڑا ہے اور ہر زمان سے الگ ہے۔ مجھے یہ افسانہ پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ انکا دھرمین غریب تو ایک بندھ کھڑا ہے اس دھل اور مقولہ کی اجازت نہیں۔ منظور حسین کا ذہن راوی بنا ہوا ہے۔ اس کے ذہن اور احساس کے واسطے سے سارا قصہ بیان ہوا ہے یہ ذہن حال کے نقشے سے مل کر بھی ماضی کے اندھیرے میں پیچھے کی طرف سفر کرتا ہے کبھی آگے چل کر مستقبل کے گم راستے پر چلتا ہے اور کبھی حال کی کھلی کے گرد دکا دکاتا ہے۔ ذہن میں خوش اسلوبی اور بصیرت کے ساتھ سفر کرتے ہوئے وہ منور کرن پیدا ہوا کرتی ہے جسے جادواں وقت کہتے ہیں اور جو زندگی اور کائنات کی کھاتی ہے۔ منظور حسین کے اس ذہنی عمل سے فطیش، بیک کی تکنیک نکلی ہے اور یہ تکنیک اندھیرے اور روشنی کی آنکھ بچھوئی بن گئی ہے۔ ایک کرن بار بار اندھیرے میں رست بناتی ہے اندھیرے میں ڈوبتے بچتے ہے چھپ جاتی ہے مگر پھر پہنچتی ہے اور پھر اندھیرے کے سنے میں اترے نکلتی ہے۔ منظور حسین کے ذہن نے بھی کن کالے کوسوں کا سفر شروع کیا ہے؟ ذہنی رہا ہے اور چل بھی رہا ہے مگر کہیں چوک چوک کر۔ ان اندھیرے راستوں کا سفر کہیں قلمی کرن کے زور پر کیا جاتا ہے۔

انہیں دم کا بھروسہ نہیں ظہر جادو
چراغ لے کہاں سامنے ہوا کے چلے

گمراہ انسان کیا باز رہا ہے۔ جب اسی اھواز سے اس نے سفر کیا ہے اور کر رہا ہے۔

افسانے کی تکنیک کے بارے میں کیا کہوں۔ افسانہ نگار کرن کا رہے تو دیکھ کر ہی جاسمیتے گے اور جیتی چادر ہوگی اسنے پاؤں پھیلائے گا۔ میں یہ ذکر بھی ضرور چھیڑتا ہوں مقدمات اور جادو اس افسانے میں کیسے آتے ہیں اور کیا روپ دھارتے ہیں مگر ذرا بتا ہوں کہ پھر مجھے اپنے دوسرے افسانوں کا بھی ذکر کرنا پڑے گا کیونکہ یہاں میں تو یہ قصہ مستقبل ہی چلتا ہے۔ ساتھ میں دوجہا اور مذہبی روایات کی بھی پر چھانچاں پڑے نکلتی ہیں۔ مثلاً ”سیڑھیاں اور دلیر“ میں تو سارا قصہ یہ ہے مگر یہ ذکر بھی آخر تو بات قیامت تک پہنچے گی اور مجھے اپنی سفلائی میں یہ بحث بھی کرنی پڑے گی کہ انسان کے حراج اور ذہن کی سماعت میں یہ صراحت کیا مقام رکھتے ہیں جن سے میں اپنے افسانے کے لئے رنگ اور خوشبو لیتا ہوں۔

